اٹھارواں باب

یارِ گمشدہ

''ہلنامت! ورنہ جان سے مار دونگا۔'' نوید کی خوفناک حد تک سرد آواز فضا میں گونجی تو سامنے والا وجود جھٹکا کھا کر مڑا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، اُس نے اپنا گن والا ہاتھ نوید پر تان لیا۔ یہ اُسکا فوری دفاع تھا۔

چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح ہوا تو ٹریگر پر انگلی رکھے نوید عالم نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''تم؟'' اُس کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''کیوں ڈر گئے مجھے دیکھ کر؟'' پی کیپ کے نیچے چہرہ مسکرایا تھا۔ گن دونوں نے اب تک ایک دوسرے پر تان رکھی تھیں۔

ایک حیران تھا

اور دوسرا محظوظ!

''تم کیا کر رہے ہو یہاں؟'' نوید نے چہرہ سیدھا کر کے حیرت سے پوچھا۔ گن اب بھی اُس پر تانے رکھی۔

''فرّخ صاحب نے بھیجا ہے، کچھ اہم اطلاعات اور کچھ اہم معلومات آپ تک پہنچانی تھی۔'' شیراز مسکرایا۔ ''سچ بتائیں! ڈرا دیا نا میں نے آپ کو؟'' اُس کے شرارتی لہجے پر نوید نے سنجیدہ نظروں سے اُسے گھورا۔

''گن نیچے کرو!'' اُس نے سنجیدگی سے کہا تو شیراز نے جلدی سے گن نیچے کی۔

''اس طرح جاسوسی کرتے ہیں؟ ہاں؟ تمہیں تمام کیمروں میں دیکھا جاسکتا ہے، اُس پر سے میں تمہارے پیچھے کھڑا ہوں اور تمہیں خبر بھی نہیں؟'' گن نیچے کرتا نوید اب اُسکی جاسوسی صلاحیتوں پر اُسے لتاڑ رہا تھا۔

''میں کیمروں میں جان کر آیا تھا سر! میں چاہتا تھا کہ آپ مجھے دیکھ لیں۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! اندر آؤ!'' وہ گن کمر میں اڑستا باورچی خانے کے دروازے کی طرف آیا، ساتھ شیراز بھی پیچھے تھا۔ باورچی خانے سے نکل کر راہداری پار کر کے جب وہ دونوں ہال میں پہنچے تو سب سامنے تھے۔ حالانکہ اس نے اُنہیں ہال نمبر دو میں اکھٹے ہونے کو کہا تھا، پر اُن میں سے کوئی اُسکی بات کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہیں تھا۔ سنتے سب تھے، پر کرتے اپنی مرضی تھے۔ اُس نے لب بھینچ کر اُنہیں دیکھا، جن کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔

''فکر نہ کرو! شیراز تھا۔'' اُس نے کسی کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے جواب دیا۔

''اسلام علیکم!'' شیراز نے دانت نکالتے اُنہیں سلام کیا۔

''تو یہ ایسے چوروں کی طرح کیوں آ رہا تھا؟'' حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''وہ خاموشی سے مجھ سے مل کر جانا چاہتا تھا۔ پر اِسکا کام خاموشی سے ہوتا نہیں ہے کبھی!'' نوید نے شیراز کو گھورتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ پھر سب کی جانب دیکھا۔

''تم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ، کوئی مسئلے والی بات نہیں ہے۔ اور تم میرے ساتھ آؤ!'' نوید نے پہلے ان سب کو اور پھر شیراز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، پھر ہال نمبر دو کی طرف جاتی راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

اُنہوں نے بھی سکھ کا سانس لیتے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی، شیراز نے تو جان نکالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

----------+---------+--------

''آپ کے گھر کے آس پاس کچھ مشکوک لوگوں کو دیکھا گیا ہے، اور کچھ مشکوک سرگرمیاں بھی ہو رہی ہیں۔'' شیراز نے کچھ کاغذات اُسکے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ھمم! فرخ صاحب نے بتایا تھا مجھے اس بارے میں۔'' نوید نے فائل دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کچھ اہم نکات ہیں، اور کچھ آگے لیے جانے والے اقدامات ہیں، جو میں نے لکھ دیئے ہیں۔ تم یہ فرخ صاحب کے حوالے کر دینا۔'' نوید نے کچھ کاغذات اُسکی جانب بڑھائے، جو اُس نے تھام لیے۔

''سر! آپکو یہاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں! پر تم یہاں صرف اتنے سے کام کے لئے آئے تھے؟''اُس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''ہرگز نہیں! میں یہاں **تین چوٹی** والی آپریشن ٹیم کے ساتھ آیا ہوں۔ تو فرخ صاحب نے کہا کہ یہ کام بھی کر دوں۔ اُسکے علاوہ ایک اور بات بھی بتانی تھی آپ کو۔''وہ رکا۔

''کیا؟''

''اگلے دو دنوں کے لیے آپ لوگ حویلی میں نہیں رہ سکتے۔ آپ لوگوں کو کھرپوچو قلعے کے پاس ایک گھر ہے، وہاں قیام کرنا ہوگا۔ گھر کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔''

''پر کیوں؟''وہ مشکوک ہوا۔

''گھر کی کل فیومیگیشن ہو گی۔''اُس نے کان سہلاتے کہا۔ نوید کی تیوری پر بل پڑے۔

''کیا فیصل کو یہی وقت ملا تھا فیومیگیشن کے لیے؟''اُس نے سختی سے پوچھا۔

''اس میں فیصل کا کوئی قصور نہیں ہے۔ فیومیگیشن کی بکنگ دو مہینے پہلے سے ہی تھی، اور پھر اُسکے خاندان والے جون کے آخر میں رہنے آتے ہیں، تو اُس سے قبل ہمیشہ فیومیگیشن ہو جاتی ہے۔''اب وہ بھلا کیا ہی کہتا؟ یہ حویلی اے ایس پی فیصل کی خاندانی حویلی تھی۔ جو سالہا سال بند رہتی تھی، فقط گرمیوں کی چھٹیوں پر جب اُسکے خاندان والے بیرونِ ملک سے پاکستان آتے، تب اُنکے یہاں قیام کے لیے کھلتی تھی۔ فرّخ صاحب کو اِس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں لگی تھی اُنکی حفاظت کے لیے، اُس نے بھی بخوشی اجازت دے دی، کیونکہ اپنے خاندان والوں میں سے صرف وہ ہی پاکستان میں مقیم تھا، لہٰذا چابیاں بھی اُسکے پاس ہوتی تھیں۔ البتہ اپنے خاندان والوں کو اُس نے کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی۔

''کیا وہ یہ کام بعد میں نہیں کروا سکتا؟''

''سر! دراصل یہ کام اُسکے چچا کے پرانے دوست دہائیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں، اگر اُس نے منع کر دیا تو وہ اُسکے چچا کو خبر کر دیں گے اور پھر اُسکے پاس بنانے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ہوگا۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! جانا کب تک ہے؟''نوید نے بیزار کن لہجے میں پوچھا۔

''آپکی حفاظت کے لیے کھر پو چو قلعے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر لیا ہے۔آپ لوگ کل کا دن گزارنے کے بعد پرسوں صبح چار بجے حویلی چھوڑ دیں گے۔پرسوں یہاں فیو میگیشن کا عمل ہوگا۔پرسوں کے بعد آپ لوگ صبح وہاں سے نکل جائینگے تو اگلے دن یہاں واپس پہنچ چکے ہونگے۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''ٹھیک ہے۔''نوید نے فقط اتنا ہی کہا پھر اُس سے گھر کے متعلق مزید معلومات لینے لگا۔

ابھی تو باقی سب کو بتانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

----------+---------+--------

اگلے روز ناشتے کی میز پر نوید عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔سوچتا رہا کہ اگر ان سب کو بتا دیا تو پتہ نہیں کیسا ردعمل دیں؟ خیر! اللہ اللہ کر کے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو اُس نے سب کو مخاطب کیا۔

''کل شیراز نے کچھ اہم معلومات دی ہیں۔''اُس نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا تو سب نے اُسے دیکھا۔

''کیسی معلومات؟''

''مورخہ چھے قریب ہے، تم سب کے گھر والے خیریت سے ہیں، کوئی مسئلے کی بات نہیں ہے۔البتہ میرے اپنے گھر کے پاس کچھ مشکوک سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ایف آئی اے اُن پر نظر رکھے ہوئی ہے۔''اُس نے کہا۔

''سب خیریت رہے گی ان شاءاللہ! کس قسم کی مشکوک سرگرمیاں تھیں؟''عمر نے تشویش سے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں بتایا گیا ہے۔ضروری ہوگا تو معلوم ہو جائیگا۔ابھی فلحال کام کی بات یہ ہے کہ ہمیں دو روز کے لیے عارضی طور پر حویلی چھوڑنی ہے۔''

''کیوں؟'' مقدم نے پوچھا۔

''ضروری ہے، میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جان لو کے اپنا ضروری سامان ایک بیگ میں کر لو، ہم آج رات چار بجے حویلی چھوڑ دیں گے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''پر جائیں گے کہاں؟'' علی نے پوچھا۔

''یہاں سے تھوڑا اوپر ایک مقام ہے۔ کھرپوچو قلعہ کہتے ہیں اُسے۔'' اُس نے کہا تو سوائے مقدّم کے باقی سب نے کوئی خاص رد عمل نہ دیا۔ وہ البتہ آنکھیں پھاڑے نوید کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیسا عجیب سا نام ہے؟ کھرپوچو؟'' حسین نے ہنستے ہوئے رضا کو کہا۔

''قلعوں کے نام عموماً ایسے عجیب سے ہی ہوتے ہیں۔'' اُس نے کہا، وہ لوگ اپنی ہی گفتگو میں مشغول تھے، اِس لیے دیکھ نہ سکے کے نوید نے کھانے کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے، ایک نظر مقدم کو دیکھا اور پھر اُسے نفی میں سر ہلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے کے بعد مقدّم کا منہ تو بند ہو گیا پر نوالہ حلق سے اُترتا دوبھر ہو گیا۔

''تو وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ مطلب اور کتنا اوپر جانا ہو گا؟'' عمر نے نوید کو مخاطب کیا تو اُس نے پہلے پانی کا گھونٹ بھرا، پھر اُن سب کو دیکھا جو منتظر نظروں سے جبکہ مقدّم تاسف سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔ بس پانچ چھے۔۔۔۔'' اُس نے بات ادھوری چھوڑی۔

''پانچ چھے کیا؟ چھے فٹ اوپر؟ یہ تو کم ہے، اتنی چڑھائی تو چڑھ ہی سکتے ہیں۔'' علی نے خود ہی اخذ کر لیا تھا۔ جواباً وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا، صد شکر کہ کسی نے دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔ البتہ مقدّم نے اپنی گھورتی نظریں اس پر مرکوز ہی رکھیں۔ وہ صرف خاموش اس لیے تھا کہ دس سالوں میں پہلی بار نوید نے اُس سے کوئی فیور مانگا تھا، انداز ایسا ہی تھا جیسا کبھی اُنکی دوستی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ صرف اس ایک دوستانہ سے فیور کے لیے مقدّم چپ رہا، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ چلا چلا کر کہہ دے کہ صرف چھے فٹ کی بات نہیں ہے۔

صبح چار بجے تک سب نے فقط ضروری سامان کا ایک ایک بیگ ساتھ رکھا اور حویلی چھوڑ دی، حسین البتہ رات بھر نوید کا دماغ کھاتا رہا کہ آخر اُنہیں کیوں یہاں سے لے جایا جا رہا ہے؟ تنگ آ کر نوید نے اسے بتا ہی دیا کہ فومیگیشن کروانی ہے۔

''تو ہم باہر لان میں بھی رہ سکتے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''رات بھی وہیں گزارو گے؟''نوید نے چڑ کر پوچھا۔

''ہاں! یہ بات تو ہے۔''اس نے کہا۔''چلو خیر ہے! اس بہانے باہر تو نکلیں گے اس حویلی سے۔''اُس نے خوشی سے کہا تو نوید چپ ہی رہا۔

حویلی چھوڑتے ہوئے بھی کسی کو شک نہ ہوا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ انکا پرسکون انداز، اور مقدّم کی ملامتی نظریں دیکھ دیکھ کر نوید دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا۔ پر کیا کرتا؟ جانتا تھا کہ اگر سچ بتایا تو وہ لوگ یہیں ٹک کر بیٹھ جائیں گے، پر جائیں گے کہیں نہیں! سفر شروع ہونے سے قبل، ان سب کو بوٹ اور ایک عدد ہائیکنگ اسٹیک پکڑا دی گئی، جسکا مطلب اِس وقت وہ لوگ ہرگز نہیں سمجھ سکے۔ پر دو گھنٹے گزرنے کے باوجود بھی جب پہاڑ ختم نہ ہوا اور پو پھوٹنے کا وقت ہو گیا، تو رضا نے اپنا بیگ زمین پر پٹخا اور پہاڑ کی پتھریلی سطح سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟''اُس کی اِس حرکت پر نوید نے رک کر دیکھا۔ باقی تینوں کی بھی بس ہو گئی تھی، لہٰذا وہ بھی باری باری وہیں بیٹھنے لگے۔

''تم نے چھے فٹ اوپر آنے کو کہا تھا، میرے خیال سے میں چھے سو فٹ چڑھائی چڑھ چکا ہوں اب تک۔''رضا نے مبالغہ آرائی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

''اور کتنا دور رہ گیا ہے نوید؟''عمر نے بھی تھک کر پوچھا۔

''چھے میں سے دو گھنٹے گزر چکے ہیں، بس چار گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔''نوید نے ذرا سنبھل کر کہا تو سب نے سنا، غور کیا، سمجھا، پھر سمجھ آنے پر مارے صدمے کے سب کا منہ ہی کھل گیا، البتہ مقدّم ابھی تک نظریں چرائے ہوئے تھا۔

''تم۔۔۔ تم نے۔۔۔ تم نے چھے فٹ نہیں کہا تھا؟''عمر نے آنکھیں پھاڑے پوچھا۔

''نہیں! میں نے تو پیچھے سے آگے کچھ کہا ہی نہیں تھا، تم لوگوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ چھ فٹ ہے۔''نوید نے بے نیازی سے کہہ کر کندھے اچکائے۔

''تو تم ہمارے اندازے کو غلط ثابت کر دیتے نا!'' رضا نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم لوگ میری کوئی بات مکمل سنتے ہو؟ سن لیتے تو میں بتا دیتا۔'' واہ! کیا بے نیازی تھی۔

''میں واپس جا رہا ہوں۔''حسین نے کندھوں پر بیگ ڈالا اور ہائیکنگ اسٹک زمین میں گاڑ کر کھڑا ہو کر اعلان کرتے، جانے کے لیے پلٹا۔ نوید اُسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔

''واپس جانے میں دوبارہ دو گھنٹے لگیں گے۔ اس سے اچھا ہے چار گھنٹے لگا کر چڑھائی ہی چڑھ لو۔'' مقدّم نے اُسکا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ تھا؟''حسین الٹا اُسکے سر ہوا۔

''نہیں!'' وہ گڑبڑایا۔

''جھوٹ مت بولو!''

''میں سوات میں رہتا ہوں، اسکردو میں نہیں جو یہاں کے راستے معلوم ہوں۔''اُس نے صاف جھوٹ بولا۔ معلوم اُسے سب تھا۔

''واللہ! میں ایس ایس پی نوید عالم سے تنگ آچکا ہوں۔''حسین نے باآوازِ بلند کہا اور منہ بناتے ہوئے واپس آگیا۔ چار و ناچار اُنہیں آگے بڑھنا ہی پڑا تھا۔

کچھ دور مزید چلنے کے بعد بالآخر انہیں ایک چھوٹا سا چائے کا کیبن نظر آیا، جسکے آگے کرسیاں لگی تھیں۔

''ناشتہ کر لیتے ہیں پہلے!''نوید نے کیبن کے پاس رکتے ہوئے کہا تو باقی سب تو جیسے انتظار میں ہی تھے۔ فوراً اپنا سامان رکھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سورج کی کرنیں پڑنے لگی تھیں، جو ابھی مکمل نہیں نکلا تھا۔

''السلام علیکم بھائی! کیا لیں گے؟''کیبن کے مالک نے کھڑکی سے منہ نکال کر پوچھا۔

''چائے اور کچھ بسکٹ بس!''نوید نے کہا اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رضا بیٹھنے کی بجائے کھائی کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ کسی نے بھی اُس پر دھیان نہیں دیا۔

''نوید!''حسین نے اُسے یکدم ہی پکارا تو اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیا ہم میں سے کسی نے یونیورسٹی کے زمانے میں تمہارے ساتھ کچھ غلط کیا تھا؟ تمہارا حق مارا تھا؟ یا تمہیں bully کیا؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا تو باقی سب نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا۔ یہ بھلا کیسا سوال تھا؟ نوید البتہ سنجیدہ تھا۔

''تم کر بھی نہیں سکتے تھے۔''جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''ایگزیکٹلی! ہم ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم تھے ہی شریف!''اُس نے اپنی مرضی کا مطلب نکالا۔ اس بے مقصد گفتگو کا کوئی مقصد سمجھ نہ آنے کے باوجود بھی سب کی توجہ حسین پر ہی تھی۔

''تو؟''نوید نے بازو سینے پر لپیٹے ہوئے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھا۔ کیبن کا مالک چائے میز پر رکھ کر گیا تو سارے میں دودھ پتی کی خوشبو رچ بس گئی۔ چائے کی پیالی اٹھاتے علی کی نظریں دور کھائی کے پاس کھڑے رضا پر گئیں، تو اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تو پھر تم ہم سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو؟''حسین نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا تو نوید کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں، چہرے پر کچھ ایسے تاثرات آئے جیسے لگا کہ وہ ابھی مسکرائے گا۔ پر وہ مسکرایا نہیں! وہ واقعی انگلیوں پر گن کر مسکراتا تھا۔

''کیا کیا ہے میں نے؟''اُسکا لہجہ سنجیدہ، البتہ آنکھوں میں دوستانہ سا تاثر تھا۔

''یہ جو تم ہمارے ساتھ کر رہے ہو، پچھلے پندرہ سولہ دنوں سے۔۔۔ کیا اُسے مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟''یہ حیرت میں ڈوبا سوال مقدّم کی جانب سے آیا تھا۔ علی کا آدھا دھیان اس طرف اور آدھا رضا کی جانب تھا۔

''مجھ سے سیدھی بات کیا کرو۔''ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے کہا گیا۔

’’تم کرتے ہو کبھی سیدھی بات؟ بلکہ تم تو بات ہی نہیں کرتے۔ اپنی مرضی کا حکم دیتے ہو اور چلے جاتے ہو، پھر واپس آتے ہو، اپنی پسند کے سوالوں کے جواب دیتے ہو، ورنہ نظر انداز کر دیتے ہو۔ اور پھر چلے جاتے ہو۔‘‘ حسین نے اُسکی شخصیت کا نقشہ کھینچا تو اُسکی آنکھوں میں تبسّم سا بکھرا، البتہ چہرے پر اُس نے اب بھی کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

’’ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا میرے پاس!‘‘ سیدھی بات، نو بکواس!

’’کیوں تم نے ملک چلانا ہوتا ہے؟‘‘ یہ غیر متوقع سوال عمر کی جانب سے آیا تھا۔ کسی کو امید نہ تھی کہ عمر اِس گفتگو میں حصّہ لینے والا ہے۔ علی کی نظریں اب بھی دور کھائی کے پاس کھڑے رضا پر تھیں، اس لیے وہ گفتگو میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔

’’ہاں!‘‘ بندہ ڈھیٹ ہو تو پھر اتنا۔

’’سیدھے سیدھے کہو، تم ہم سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔‘‘ مقدّم نے بھی سیدھی سیدھی بات کی۔

’’سیدھے سیدھے کہہ دوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔ اس لیے خود ہی سمجھ لیا کرو!‘‘ اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ بد لحاظ، بد اخلاق، بے مروت آدمی!

’’ہمیں کیوں برا لگے گا بھلا؟ ہمیں کیا۔۔۔ تم ہم سے بات کرنا پسند کرو یا نہ کرو!‘‘ حسین نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ علی نے، سر جھکائے کھائی کی طرف مزید آگے ہوتے، رضا کو پریشانی سے دیکھا۔ وہ کر کیا رہا تھا آخر؟

’’ہاں! دن میں چار مرتبہ مجھے یہ جتا کر، کہ میں بات کرنا پسند نہیں کرتا، یا بات ہی نہیں کرتا، میرے پیچھے میری برائیاں کر کے بھی، تمہیں مجھ سے کیا؟‘‘ نوید نے کندھے اُچکاتے، ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے اُنہیں حیران کیا۔

’’تم اتنے اہم نہیں ہو۔ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو۔‘‘ مقدّم نے جتانا ضروری سمجھا۔ نوید نے بیساختہ اُمڈتی مسکراہٹ کو لبوں پر روکا۔

’’میں نے تو وہ کہا جو میں نے دیکھا۔‘‘ آج بڑی فرصت تھی، ایس ایس پی صاحب کے پاس شاید!

’’دفع کرو!‘‘ حسین نے موضوع سمیٹنا چاہا۔

''نہیں! پہلے مجھے سیدھے سیدھے بتاؤ کہ میں کیا کر رہا ہوں پچھلے پندرہ سولہ دنوں سے تمہارے ساتھ؟''نوید نے آگے ہوتے ہوئے کہا، وہ آج چھوڑنے کے موڈ میں نہ تھا۔

''رہنے دو! مذاق کر رہے تھے دونوں۔ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔''عمر نے اُسکی طرف سے جواب دے کر بات ختم کرنی چاہی۔

''کیوں تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''اُس نے عمر کے بجائے حسین سے پوچھا۔

''میں؟اور تم سے ڈروں گا؟ایسا کیا ہے تم میں ڈرنے والا؟''حسین نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''بات شروع کی ہے تو ختم بھی کرو پھر! کب تک میرے پیچھے ہی میری برائیاں کرتے رہو گے؟''اس بات پر لمحے کو علی کے کان کھڑے ہوئے،اس نے چور نظروں سے نوید کو دیکھا۔توجہ رضا کی جانب سے منتقل ہو گئی۔

''میری ایک بات تم غور سے سنو!''مقدّم نے یکدم ہی آگے کی طرف ہوتے ہوئے نوید کو مخاطب کیا۔''ہم میں سے کوئی بھی تم سے نہیں ڈرتا۔وہ تو بس!۔۔۔''وہ رکا۔

''وہ تو؟''نوید نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''وہ تو تم نے اپنا اورا(aura) ہی ایسا بنا رکھا ہے کہ بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے، پتہ نہیں کب کس بات کا کیا مطلب نکال لو؟'' بات مکمل علی نے کی تھی، جسکی دلچسپی اس گفتگو میں اچانک ہی بیدار ہوئی تھی۔

''اورا؟''نوید نے بھنویں اُچکاتے نا سمجھی سے پوچھا۔

''کیا ایس ایس پی؟اورا بھی نہیں پتہ تمہیں؟''حسین بدمزہ ہوتے ہوئے اپنے ازلی انداز میں بولا۔

''تو میں نے کیا تم میں سے کسی کو برا بھلا کہا؟کسی کو مارا پیٹا؟کسی سے بدتمیزی کی؟کیا کر دیا ہے میں نے ان پندرہ سولہ دنوں میں؟''نوید نے اب کہ سنجیدگی سے پوچھا۔اول الذکر دو سوالوں کے بعد والے سوال پر کوئی متفق نہیں تھا۔

''نہیں! پر تم بہت سنجیدہ ہو گئے ہو۔بہت زیادہ! تم سے بات کرتے ہوئے بہت اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔اس لیے آسان نہیں لگتا تم سے کچھ بھی کہنا،حالانکہ تم ایسے نہیں تھے۔''عمر نے آرام سے کہا تو اُس نے ایک نظر اُسے دیکھا۔

''کیونکہ کسی ایک کو سنجیدہ رہنا پڑتا ہے۔ اگر میں بھی تم لوگوں کی طرح ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا، تو ہم سب اس قاتل کے ہاتھوں بے خبری میں مارے جائیں گے۔'' اُس نے سکون سے جواب دیا تو دو لوگوں کو تو آگ ہی لگ گئی۔

''کیا مطلب ڈھیلے؟'' مقدّم نے بھنویں سکیڑ کر خفگی سے پوچھا۔

''مطلب لاپرواہ، غیر ذمہ دار، غیر سنجیدہ۔'' بندہ منہ پھٹ ہو تو پھر اتنا!

''یہی وہ وجہ ہے کہ تم سے بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ بتاؤ کیا اس طرح کسی کی برائی کرتے ہیں؟'' حسین نے برا مناتے ہوئے سب سے پوچھا۔

''ہاں! اسی طرح کرتے ہیں۔۔۔ منہ پر، پیٹھ پیچھے نہیں!'' اُس نے پہلی بار ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ (تالیاں ہو جائیں ایس ایس پی صاحب کے لیے!)۔ اس بار چاروں نے اُسے ایک ساتھ دیکھا۔ کتنے عرصے بعد اُسکا ایسا موڈ دیکھا تھا۔ جیسے کبھی وہ یونیورسٹی کے زمانے میں جان کر دوسروں کو چھیڑا کرتا تھا، اُنکو چڑانے اور تپانے کا موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُسکا موڈ خراب ہو۔

''تو تمہیں ہم اتنے بڑے بڑے، پانچ عدد مرد لاپرواہ اور غیر ذمّے دار نظر آرہے ہیں؟'' مقدّم نے ایک مرتبہ پھر خفگی سے پوچھا، نوید مسکراتا ہوا اُسے سنتا رہا۔ ''کون ہے غیر ذمّے دار؟ یہ؟ (ہاتھوں سے برابر بیٹھے عمر کی جانب اشارہ کیا) جو پورا کاروبار اکیلے چلاتا ہے؟''

''آدھا!'' علی نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا جسے نظرانداز کیا گیا۔

''یا یہ (اب کہ علی کی جانب اشارہ کیا) جو خود دو بچوں کا باپ ہے؟ یا میں (اپنی جانب اشارہ!) جو پوری فرم اکیلے چلا رہا ہوں۔ یا یہ (حسین کی طرف اشارہ کیا) ہاں! یہ تو ہے۔'' اس سے پہلے کہ حسین کچھ کہتا اُس نے فوراً دور کھڑے رضا کی جانب اشارہ کیا۔

''یا وہ۔۔۔ جو چھبیس بچوں کا باپ۔۔۔'' وہ بولتے بولتے یکدم رکا۔

''یہ کیا کر رہا؟'' اُسکی نظریں، سر جھکائے کھائی کے بالکل کنارے کھڑے رضا پر گئیں تو وہ چونکا۔

''میں بھی اتنی دیر سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ یہ وہاں کر کیا رہا ہے؟'' علی نے بھی کہا، اچانک ہی سب کی توجہ کا مرکز رضا بن گیا تھا، جسکی اُن سب کی جانب پیٹھ تھی۔

''یہ آگے کیوں بڑھ رہا ہے؟ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟'' حسین نے اُسے مزید ایک قدم آگے بڑھتا دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''حسین۔۔۔ کہیں یہ۔۔۔ یہ خودکشی تو نہیں کر رہا؟'' علی کو اپنی آواز خود کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس بات پر نوید جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

''تم لوگ خاموش رہو، میں اسے وہاں سے ہٹاتا ہوں۔'' نوید نے سنجیدگی سے کہا اور آہستگی سے رضا کی جانب بڑھا، جسکا دایاں پاؤں بالکل کھائی کے دہانے پر تھا، بس ذرا سا آگے بڑھنے کی دیر تھی اور وہ کھائی کی نذر ہوتا۔ وہاں خوف سا چھا گیا۔ یہ رضا کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟ وہ اچھا بھلا تو تھا۔ نوید آہستگی سے اُسکے پیچھے گیا۔

رضا کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اُس نے جھکے چہرے کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور اگلے ہی لمحے نوید نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

''ارے! کون ہے؟'' وہ چیخا، پر نوید نے اُسکی چیخ کو نظرانداز کیا اور اسی طرح، اُسے بازوؤں میں جکڑے پیچھے گھسیٹا۔

''ارے! چھوڑو مجھے! پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' وہ چیخ رہا تھا، جبکہ دوسری جانب باقی چاروں خوفزدہ نظروں سے، اُن دونوں کو آپس میں گتھم گتھا دیکھ رہے تھا۔

''چھوڑو مجھے!'' نوید اُسے پیچھے گھسیٹ رہا تھا، اور وہ بھی واپس کھائی کے کنارے جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو رضا!'' نوید نے پوری قوت سے اُسے پیچھے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔'' اُس نے بھی نوید کو دھکّا دینے کی کوشش کی، پر ایس ایس پی صاحب کے آگے کس کی چلتی ہے؟

''ارے! میرا ڈرون۔۔۔۔'' اس بار وہ پوری قوت سے چیخا اور نوید کو پیچھے دھکّا دے ہی دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے پتھریلی سطح سے ٹکرایا، اور اگلے ہی لمحے رضا کے ہاتھ میں تھاما ڈرون کیمرے کا ریموٹ، سب کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اُس نے تیزی سے ڈرون کو کنٹرول کیا، جو بس کریش لینڈنگ کرنے ہی والا تھا، اور اب کہ ڈرون بھی نظر آ گیا۔

صد شکر کہ کریش ہونے سے پہلے ہی رضا نے اُسے قابو کر لیا اور وہ سیدھا اُسکے ہاتھوں میں آیا، جسے اُس نے سرعت سے پکڑا۔ پہلے تو اُس نے ڈرون الٹ پلٹ کر تسلی کی کہ اُسے کچھ ہوا تو نہیں ہے؟ پھر غضبناک ہو کر نوید کو دیکھا، جو اپنا بازو سہلاتا، لب بھینچے علی کو گھور رہا تھا۔

جبکہ علی نظریں چراتا یہاں وہاں دیکھنے میں مصروف تھا۔ حسین، مقدّم اور عمر نے منہ کھولے رضا کو دیکھا، پھر پلٹ کر بیساختہ علی کو، جو فلحال کسی سے بھی نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

''کیا کر رہے تھے تم؟ پاگل ہو گئے تھے کیا؟'' رضا چیخا۔۔۔ایس ایس پی نوید عالم پر؟

''تم۔۔۔تم کھائی کے کنارے کیا کر رہے تھے؟''نوید گڑ بڑایا۔ شاید پہلی بار!

''سورج طلوع ہونے کا منظر کیپچر (قید) کر رہا تھا کیمرے میں۔''اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ شکر آس پاس اُن لوگوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ کیبن کا مالک بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔

''اوہ! تو تم ویڈیو بنا رہے تھے؟ ہمیں لگا کہ۔۔۔''علی نے بیساختہ کہا اور پھر رکا۔

''کہ؟ کہ کیا؟ آگے بولو؟ یہی لگا نہ کہ میں خودکشی کر رہا تھا؟''اُس نے کینہ توز نظروں سے سب کو دیکھا۔

''ہمارا قصور نہیں ہے، ہمیں تو علی نے کہا تھا۔''مقدّم نے فوراً سارا ملبہ اُسکے سر ڈالا۔

''خدا کی قسم! یہ آدمی کبھی میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔''رضا نے چڑ کر کہا،اس ساری صورتحال میں علی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

''کچھ نہیں تو مجھ سے پوچھ ہی لیتے کہ میں وہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں؟ آتے ہی حملہ کر دیا۔''اب کہ اُس نے نوید کو دیکھ کر کہا۔

''کیسے پوچھ لیتا؟ مجھے تو یہی لگا کہ تم خودکشی کر رہے ہو۔''نوید بھی جھنجھلایا ہوا تھا۔

''کیوں لگا تم لوگوں کو ایسا؟ پاگل ہوں کیا میں؟ بیٹھے بیٹھے خودکشی کے شوق چڑھتے ہیں مجھے؟ علی کی بات پر تو یقین ہی نہ کیا کرو۔''وہ ٹھیک ٹھاک تپ گیا تھا۔

''کیوں؟ میں نے کیا کر دیا ہے ایسا؟''اُسکے کان کھڑے ہوئے تو فوراً پوچھا۔ حالانکہ اُسکا یہ سوال کرنا بنتا نہیں تھا۔

''تم نے اُس رات جو حرکت کی تھی، اُسکے بعد تمہارا بھروسہ کیا بھی نہیں جا سکتا۔''اتنی دیر سے خاموش عمر نے اُسکی گمشدگی والی رات کا ذکر کیا۔ جبکہ باقی دونوں اب دانت نکالے ہنس رہے تھے۔

''کیا حرکت کردی تھی میں نے؟ کچھ دیر اکیلا ہی تو رہنا چاہتا تھا، اگر انتظار کر لیتے تو واپس آ ہی جاتا۔'' رضا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے ڈرون نکالا کب تھا؟'' مقدّم نے بھی بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جب تم لوگ فضول گفتگو میں وقت ضائع کر رہے تھے۔'' اُس نے منہ بنایا۔ گھورتی نظریں اب بھی علی پر ہی تھیں۔ نوید بھی وہاں آیا اور ایک نظر علی کو دیکھا۔

''تم بھی سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' اُس نے علی کو سنجیدگی سے کہا پھر باقی سب کو دیکھا۔

''اب اپنا اپنا سامان اُٹھاؤ اور اٹھو! ہمیں آگے چلنا ہے۔'' نوید نے کہا۔

''چائے تو پینے دو۔'' رضا نے کہہ کر چائے کی پیالی لبوں سے لگا لی۔

--------+---------+----------

''یہ گھر ہے؟'' اپنا بیگ اُس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر کے، چھوٹے سے صحن میں رکھتے ہوئے حسین نے پوچھا۔ یہ گھر کھرپو چو قلعے سے تھوڑا فاصلے پر بنا تھا۔ گھر کے دروازے سے قلعے کی لمبی اور مضبوط اینٹوں سے بنی دیوار نظر آتی تھی۔ صحن کی کھلی چھت سے آس پاس کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

''ہاں! یہی ہے۔'' نوید نے کہا۔ صحن کی بائیں جانب واش بیسن لگا ہوا تھا۔ اُسی کے برابر میں باورچی خانے کا دروازہ تھا۔ دائیں جانب، ایک بیت الخلا، اور ایک غسل خانہ تھا۔ سامنے کی جانب دو دروازے تھے، جو دراصل دو کمرے تھے۔

''یہ؟ اتنا چھوٹا سا؟'' مقدّم کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

''اب ہر مرتبہ انگریزوں کے دور کی حویلی تو نہیں مل سکتی نا؟'' عمر نے اُسے جواب دیا۔

''یہاں بھلا کیسے رہیں گے؟'' حسین نے ہاتھوں کا چھجّا بناتے ہوئے کہا، دوپہر ایک بجے کی دھوپ اُنکی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔

''تم نے یہاں ساری زندگی نہیں گزارنی، بس آج کا دن ہے۔ ہم کل صبح ہی واپسی کے لیے نکل جائیں گے۔'' نوید نے کہا اور اپنا بیگ صحن میں رکھے تخت پر رکھ دیا۔

''تم لوگ اندر جا سکتے ہو۔ دو کمرے ہیں۔ اسی میں سب کو رات گزارنی ہے۔'' اُس نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ کمرہ سادہ سا تھا۔ چاروں جانب کشن رکھے تھے، درمیان میں قالین بچھا تھا، جسکے عین اوپر چھت کے درمیان ایک چوکر سا روشن دان تھا، جس سے صبح کی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ باری باری منہ ہاتھ دھونے کے بعد جسکو جہاں جگہ ملی، وہ وہیں پڑ گیا۔ چھ گھنٹے کی چڑھائی نے اُنکا جو حال کیا تھا، اُسکے بعد وہ، سوائے نوید کو دل ہی دل میں کوسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ علی کا تو پاؤں ہی سوج گیا تھا، لہٰذا وہ اُسے سیدھا کر کے، قریب ہی کشن پر ڈھیر ہو گیا۔ رضا خود اپنے پاؤں کا مساج کر رہا تھا جبکہ نوید تاسف سے اُن لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کا حال ہی برا ہو چکا تھا۔ صرف مقدّم ہی تھا جو سکون سے بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آہ! میرا پاؤں!'' حسین نے دہائی دی تھی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم لوگ اتنے نازک نکلو گے۔ اتنی سی چڑھائی چڑھ کر یہ حال ہے۔'' نوید سے ضبط نہ ہوا تو بول پڑا۔

''اتنی سی؟'' سب نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''اتنی ہی سی تھی۔ تم لوگوں سے زیادہ تو یہاں کے بچے چلتے ہیں دن بھر۔ اور تم سب یہاں بوڑھوں کی طرح رو رہے ہو۔ مرد بنو!'' نوید نے لتاڑا۔ اُسکے انداز و مزاج میں آہستہ آہستہ رونما ہونے والی تبدیلی کو سب ہی نوٹ کر رہے تھے۔ نوید کا اسطرح اپنے خول سے آہستہ آہستہ باہر آنا، خوش آئند تھا۔

''تم نا۔۔۔ بولا ہی مت کرو تو اچھا ہے۔ جب بولتے ہو کچھ زہر ہی اگلتے ہو۔'' حسین کو اس وقت اُسکی نصیحت بالکل پسند نہیں آ رہی تھی۔

''تم نے ہی کہا تھا کہ بولا کرو۔'' اُس نے جواب دیا۔ یعنی اب بھگتو!

''بولنے اور زہر اگلنے میں فرق ہوتا ہے۔'' حسین نے جتایا۔

''وہ دونوں چپ ہوتے ہیں تو یہ دونوں شروع ہو جاتے ہیں۔'' مقدّم نے بیزاری سے کہا۔ واقعی رضا اور علی کے بعد حسین اور نوید کی کوئی نہ کوئی کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کا انتظام اُنکے لیے وہاں کے ایک رہائشی نے کر دیا تھا۔ رات اُنہوں نے صرف پھلوں پر گزرا کرنا تھا۔ ویسے بھی رات ہوتے ہوتے یہ گھر برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ علی نے تو ڈبل جیکٹ پہن لی تھیں۔ پر سردی تھی کہ ہڈیوں میں گھس رہی تھی۔ آس پاس اتنا سنّاٹا تھا کہ عجیب وحشت طاری ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اب تو کمرے سے نکل کر صحن میں بنے باتھروم تک جانے کی ہمت بھی نہ تھی۔

''حسین! ایک بات تو بتاؤ!'' مقدّم نے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے گفتگو کرنا مناسب سمجھا۔ جانتا تھا رات کسی نے بھی نہیں سونا۔

''پوچھو!'' سیب کی قاش منہ میں رکھتے حسین نے پوچھا۔ پھر دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے تمہاری منگنی تو تمہاری کسی کزن سے ہوئی تھی۔ کیا نام تھا اُسکا؟'' مقدّم نے ذہن پر زور دینا چاہا۔

''ایمان نام تھا اُسکا۔'' حسین نے کہا۔

''تو پھر یہ حورعین سے تمہاری شادی کیسے ہو گئی۔'' اس بات پر رضا کے کان کھڑے ہوئے۔ اس سوال کا جواب حسین نے اُسے بھی نہیں دیا تھا۔

''لمبی کہانی ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میں سننے کو تیار ہوں۔ بہت لمبا وقت ہے صبح ہونے میں۔'' اُس نے دلچسپی سے کہا۔

''دیکھو! ابّا نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟ میں نے کہا نہیں! تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہاری منگنی ایمان سے کر رہا ہوں۔ میں نے کہا جیسے آپکی مرضی۔۔۔''

''یہاں تک تو ہمیں بھی معلوم ہے۔'' رضا نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ پر مسئلہ تب کھڑا ہوا جب۔۔۔''

----------+---------+--------

''تم نے ایمان سے شادی کے لیے ہاں کر دی؟'' حسین اپنے سے ایک سالہ بڑے بھائی کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا، جب حور عین تن فن کرتی وہاں آئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز، چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ ایک ہی پلیٹ میں سے فرائیز کھاتے حسین اور اُسکے بھائی نے حیرت سے اُسے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا تھا اسکو؟

''ہاں! تو؟'' حسین نے کہا۔

''کیوں؟'' وہ تقریباً چیخی تھی۔ آنسو آنکھوں سے چھلک کر گالوں پر بہہ نکلے۔

''کیا مطلب کیوں؟'' حسین نے آنکھیں پھاڑ کر اور منہ کھول کر اُسے دیکھا۔ اُسکے بھائی نے غیر محسوس انداز میں فرائیز کی پلیٹ اُسکے ہاتھوں سے لے لی۔

''کیوں مطلب کیوں ہی ہوتا ہے حسین!'' اُس نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

''اب اس کیوں کا کیا جواب دوں؟ ابّا نے پوچھا اور میں نے ہاں کر دی۔ بس!'' اُسے اس سوال کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا تھا، اُسکا بھائی فرائیز سے انصاف کرتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ صد شکر کہ حسین کی توجہ اُسکی جانب نہ تھی۔

''تو تم منع نہیں کر سکتے تھے؟'' اس نئے مطالبے پر تو اس کا دماغ ہی گھوم گیا۔

''کیوں منع کر دیتا؟'' اُس نے مزید حیرت سے پوچھا۔

''کیوں؟ پسند کرتے ہو اُسے؟'' ایک اور عجیب سوال۔

''ناپسند بھی نہیں کرتا۔'' اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! جاؤ کر لو شادی، میں بھی ابّو کو اظہر کے لیے ہاں کر رہی ہوں۔'' وہ پیر پٹختی جانے کے لیے مڑی۔

''وہ تو میں کروں گا ہی۔ پر تمہیں کیا ہوا ہے اچانک؟ تم سے مشورہ نہیں لیا اِس لیے رو رہی ہو؟'' اپنے پیچھے اُسے حسین کی آواز سنائی دی پر وہ رکی نہیں۔

''یہ کیا پاگل ہے؟'' حور کے جانے کے بعد اُس نے اپنے بھائی کو دیکھ کر پوچھا جو پوری پلیٹ چٹ کر چکا تھا۔

''پاگل وہ نہیں! پاگل تم ہو۔ سیدھی سیدھی بات سمجھ نہیں آئی تمہیں؟'' اُسکے بھائی نے کہا۔

''مطلب؟'' اُسے واقعی سمجھ نہیں آئی۔

''مطلب یہ کہ تم گھاس کھاؤ!'' وہ پلیٹ اُسکے حوالے کر کے اندر چلا گیا۔

''میری فرائیز!'' وہ خالی پلیٹ دیکھ کر صدمے سے چیخا تھا۔

--------+---------+----------

اور جب تک حسین کو سمجھ آئی۔ اُسکی اور ایمان کی منگنی کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ سمجھ آنے پر اُس نے پہلے اپنا سر پیٹا، پھر حور عین کی عقل پر ماتم کیا، جو اُسکی دوستی کا مطلب غلط نکال کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ اور بات ہے کہ اگر ابّا اُس سے حور عین کے لیے پوچھتے تو بھی وہ انکار نہ کرتا، ایمان سے بھی اُسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مختصر لفظوں میں وہ ابّا کی پسند پر راضی تھا، اُسکی اپنی کوئی خاص پسند نہ تھی۔ اور ایسا بس اُسے لگتا تھا، پر اپنے اندازے کے غلط ہونے کا اُسے تب احساس ہوا، جب اُسے حور عین اور اظہر کے رشتے کی اطلاع ملی۔

''تم پاگل ہو کیا؟ تم نے اظہر کے رشتے کے لیے ہاں کیوں کر دی؟'' آج وہی سوال حسین اُسکے سر پر کھڑا کر رہا تھا۔ اور کیوں کر رہا تھا؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

''کیوں کا کیا مطلب؟'' صوفے پر بیٹھ کر ناخنوں کو فائلر سے رگڑتی حور عین نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور سکون سے جواب دیا۔

''تم ایسا ضد میں کر رہی ہو نا؟'' وہ بے بسی سے بولتا اُسکے سامنے والے صوفے پر بیٹھا۔ وہ پہلی بار اتنا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

''کونسی ضد؟ ضد کہاں سے آ گئی اس میں؟'' وہ حیران ہوئی۔ یا حیران ہونے کی اداکاری کی۔

''حور! وہ تم سے عمر میں بہت بڑا ہے۔ اور تم دونوں کے مزاجوں میں بھی بہت فرق ہے۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''کیا میں نے تم سے مشورہ مانگا؟''

''میں نے کب تمہیں کوئی امید دلائی؟ یا تم سے کوئی وعدے کر لیے جو تم اسطرح کر رہی ہو؟'' وہ جھنجھلایا، اُسے خود بھی نہیں پتہ کہ کیوں؟

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' اب کہ اُس نے بھی بیزاری سے فائلر میز پر پٹخا۔

''یہ تو تم بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم خوش نہیں رہو گی اُسکے ساتھ۔ روبوٹ ہے وہ آدمی۔۔۔ روبوٹ!''

''تمہیں کیا میں روبوٹ سے شادی کروں یا خلائی مخلوق سے؟ تم نے تو ایمان سے شادی کر لی نا؟'' وہ ایک مرتبہ پھر روہانسی ہوئی۔ حالانکہ وہ اس طرح بات بات پر رونے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ رلانے پر یقین رکھتی تھی۔ اُسکا مشہور زمانہ مقولہ تھا کہ جو جینا حرام کرے، اُسکا مرنا حرام کر دو۔

''شادی نہیں منگنی ہوئی ہے۔ اور منگنی ختم بھی کی جا سکتی تھی۔ اگر تم یہ فضول اقدام نہ لیتی تو۔'' حسین کی زبان سے بیساختہ پھسلا تھا۔ اُسے خود بھی پتہ نہ چلا کہ یہ اُس نے کیسے کہہ دیا؟

''کیا مطلب؟ تم۔۔۔ تم منگنی ختم کر دیتے؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ حسین کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ یہاں اُسے امید دلانے نہیں آیا تھا۔

''نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ میرا مطلب۔۔۔ تمہیں مجھ سے اچھا اور مجھ سے بہترین کوئی انسان مل جائیگا۔ تم اظہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد مت کرو۔'' اُس نے سکون سے سمجھانا چاہا۔

''تم کیوں نہیں؟'' وہ ضدی ہوئی۔

''کیونکہ میں تمہیں صرف دوست سمجھتا ہوں۔ بیوی کی حیثیت سے نہیں سوچتا تمہیں۔'' اُسکی بات پر حور عین کا چہرہ تاریک ہوا۔

''حور! تم چاچو کی اچھی بیٹی ہو، ابّا کی بھی چہیتی ہو، اگر میں تمہاری ضد کے آگے جھک بھی جاؤں، تو ابّا اور چاچو تو شاید بخوشی راضی ہو بھی ہو جائیں، لیکن مجھے بتاؤ! ان سب میں ایمان کا کیا قصور؟ اُس بیچاری نے میرا یا تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اگر تم پہلے یہ سب کہتی تو میں شاید ابّا سے

خود بات کرتا، پر اب نہیں! کیونکہ اب ان سب میں صرف ایک انسان کو تکلیف پہنچے گی۔اور وہ ہے ایمان۔اور اُسکا دل دکھا کر ہم دونوں خوش نہیں رہ سکتے۔"اُس نے دونوں کہا۔ تم نہیں کہا۔ حور عین کے آنسو یکدم تھمے۔

"میں جانتاہوں تم کسی کا دل دکھانے والی انسان نہیں ہو۔ تم کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ صرف اپنی خوشی کے لیے ہم دونوں کسی کا دل نہیں دکھائیں گے۔ ٹھیک ہے؟"اُس نے پھر دونوں کہا۔ وہ بار بار کچھ نہ کہہ کر بھی سب کہہ رہا تھا۔

"پلیز! اس بات کو اب یہیں ختم کرو۔ ہم دونوں دوبارہ اِسکا ذکر نہیں کریں گے، اور ویسے ہی رہیں گے جیسے رہتے ہیں۔ تم بھی سب بھول جاؤ اور اظہر کے لیے انکار کر دو۔"اُس نے حتمی انداز میں کہا۔

"اب نہیں کر سکتی، کل وہ لوگ رسم کے لیے آ رہے ہیں۔ ابّو خوش ہیں بہت، اور میں اُنکا سر نہیں جھکا سکتی۔"اُس نے آہستگی سے کہا تو حسین افسوس کے ساتھ اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

--------+---------+----------

حسین اوپر سے جتنا لاابالی تھا، پر اندر سے وہ اتنا ہی سمجھدار، اور ذمہ دار تھا۔ وہ احساس کرنا جانتا تھا۔ اُس نے نہ صرف حور عین کو سمجھا لیا، بلکہ خود کو بھی حتی الامکان اُس سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ پر حور عین پھر بھی پہلے کی طرح ہی اُس سے بات کرتی تھی۔ معلوم نہیں وہ راضی ہو گئی یا نہیں۔ پر اُس نے دوبارہ حسین سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ ویسے بھی حسین کو ایسا کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا اُس سے۔ ایسا صرف اُسے لگتا تھا۔

اُسکی منگنی تک وہ چڑچڑا ہونے لگا تھا۔ حالانکہ جب وہ خوش نظر آنے لگی تھی تو اُسے بھی خوش اور مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، پر وہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ اظہر جیسے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے والے بندے کو دیکھتا، تو چاچو پر غصّہ آتا کہ کیا سوچ کر اپنی لاڈوں پلی بیٹی اُسکے حوالے کر دی۔ ایمان کبھی کبھی اُس سے پوچھتی کہ آج کل وہ اتنا سنجیدہ کیوں رہنے لگا ہے؟ تو وہ صنوبر کے مقدمے کا بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ ایمان اچھی لڑکی تھی، وہ اُسکے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز اُنکی زندگی میں ایسا آیا، جس نے اُن سب کی تقدیریں بدل دی۔ اُس روز حور عین کو اُسکی ساس نے ضد کر کے اظہر کے ساتھ شادی کی خریداری پر بھیج دیا۔ اظہر کو کیا پسند کرنا تھا؟ وہ تو بیزار منہ بنائے، بس اس انتظار میں تھا کہ حور عین اپنی خریداری کرے اور وہ

یہاں سے بھاگے۔ بار بار منہ بناتا گھڑی دیکھتا، جیسے پتہ نہیں کتنا وقت برباد ہو رہا ہو؟ حور عین کو اُسکی بیزاری نظر آ رہی تھی، پھر بھی ڈھیٹ بنی پورا مال گھومتی رہی۔

''حور عین! اگر آپ کو کچھ پسند نہیں آ رہا تو بتا دیجیے۔ ہم پھر کسی دن آ جائیں گے۔'' بلآخر جب اظہر کا ضبط جواب دے گیا تو اُس نے ذرا ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے درخواست کی۔

''ارے! دوبارہ کیوں آ جائیں گے؟ ابھی تو ایک ہی فلور دیکھا ہے، پہلے تسلی سے پورے مال کی دوکانیں دیکھ لوں، پھر آخر میں فیصلہ کروں گی کہ کہاں سے لہنگا لینا ہے۔'' اُس نے بھی ڈھٹائی سے کہا تو اظہر نے ضبط کیا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کرتے کیا ہیں؟ چھ مہینے پاکستان اور چھ مہینے دبئی۔ یہ کیسا کام ہے؟'' اُسکے ساتھ چلتے ہوئے حور عین نے اُسکی بوریت دور کرنے کے لیے سوال کیا۔

''آپکو میرے کام سے کیا لینا دینا؟'' اُس نے یکدم ہی رک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا مطلب مجھے کیا لینا دینا؟ مجھے لینا دینا نہیں ہو گا تو اور کس کو ہو گا؟'' وہ حیران ہوئی۔ سال ہونے والا تھا انکی منگنی کو اور حور عین کو اب تک اُسکے بارے میں بنیادی معلومات بھی نہ تھیں۔

''حور عین!'' وہ رکا تو وہ بھی رک گئی، اُسکے چہرے پر ناگواری سی چھائی ہوئی تھی۔ ''ایک بات میری آپ آج اچھے سے ازبر کر لیں۔ مجھے وہ عورتیں ہرگز نہیں پسند جو مردوں سے سوال جواب کرتی ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں، کہاں آتا جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں؟ یہ آپکا میٹر نہیں ہے۔ ازاٹ کلیئر؟'' اُس نے اتنی سختی سے کہا کہ وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔ اتنی سختی سے اُس سے آج تک کسی نے بات نہیں کی تھی۔

''اب آپ کو کچھ نہیں لینا تو فوڈ کورٹ چلتے ہیں۔ امی نے کہا تھا کہ آپکو لنچ کروا کر ہی آؤں۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ آنسو پیتی اُسکے پیچھے آئی۔ وہ تیز تیز چلتا اُس سے بہت آگے جا رہا تھا، اُس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش میں وہ تھکنے لگی تھی۔ اُسی لمحے حور عین کو احساس ہوا کہ وہ تاعمر اُسکے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکے گی۔ وہ فوڈ کورٹ میں پہنچے تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سامنے ہی حسین اور ایمان ساتھ مل گئے تھی۔

''تم دونوں؟''حور عین اُنہیں دیکھ کر حیران ہوئی۔اظہر بھی رک گیا۔

''ایمان کا نکاح کا جوڑا غلط آگیا ہے،اُسے تبدیل کروانے آئے تھے۔سوچا کہ لنچ بھی کر لیں۔''حسین نے اظہر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

''ہم بھی لنچ ہی کرنے آئے ہیں۔چلیں ساتھ ہی کرتے ہیں،اگر آپ دونوں کو برا نہ لگے تو۔''اظہر نے ایمان کی جانب دیکھتے پیشکش کی،تو حور عین کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''نہیں!ہمیں کیوں برا لگے گا؟''ایمان نے کہا۔

''چلیں!پھر آئیں۔''وہ لوگ ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

''تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''حسین نے پیچھے آتی حور عین سے آہستگی سے پوچھا۔

''میرا کیوں منہ لٹکا ہو گا؟بالکل ٹھیک ہوں میں۔بلکہ منہ تو آج کل تمہارا لٹکا ہوا ہے۔''اُس نے دوبدو جواب دیا تو وہ اداسی سے مسکرایا۔جب سے اُسکے دوست الگ ہوئے تھے،وہ چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔وہ لوگ میز پر پہنچے تو اظہر،ایمان سے اُسکی پڑھائی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

''کھانا کون آرڈر کر رہا ہے؟''حور عین نے بیٹھتے ہی اپنے لاپرواہ انداز میں کہا تو اظہر نے بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔

''کھانا ہم آرڈر کر دیں گے،آپ پریشان نہ ہوں۔''حسین نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اظہر کے سامنے بھی وہ باؤلی اپنے ازلی انداز میں ہی بات کر رہی تھی۔

''ہاں!اور بعد میں تم مجھ سے حساب کتاب کرو گے؟ایسا ہرگز نہیں ہو رہا۔ابھی فیصلہ کرو۔''وہ شاید اُسکا اشارہ سمجھی نہ تھی۔

''جانے دو نہ حور!آج حسین کی طرف سے لنچ ہے۔''ایمان نے درمیان میں کہا۔

''ٹھیک ہے!لنچ میری طرف سے اور ڈرنک حور کی طرف سے۔''حسین نے فوراً اعلان کیا۔وہ چاہتا تھا کہ وہ ڈرنک لینے اٹھے تو وہ اسی بہانے اُسے اکیلے میں سمجھا سکے کہ اُسکی ان بچکانہ حرکتوں کو اظہر سخت ناگوار نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

''آ گئے نا اصل بات پر؟ پتہ تھا مجھے۔''اُس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں آ گیا مطلب کی بات پر، اب اٹھو اور جا کر ڈرنک آرڈر کرو۔ میں کھانا آرڈر کر کے آتا ہوں۔''حسین نے کھڑے ہوتے ہوئے ایک نگاہ، اظہر پر ڈالی جو شدید ناگواری سے حور عین کو دیکھ رہا تھا۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتا آگے بڑھا، وہ بھی اُسکے پیچھے ہی آ رہی تھی۔

''کیا آپکی اور حسین کی پسند کی شادی ہے؟''اُنکے جانے کے بعد اظہر نے ایمان سے پوچھا۔ نظریں دور ہوتے حسین پر تھیں۔

''نہیں! بڑوں کی مرضی پر ہو رہی ہے۔ پر ہماری رضامندی شامل ہے۔''ایمان نے آہستگی سے کہا۔ وہ ایسی ہی تھی، آہستہ سے اور نرمی سے بات کرنے والی۔

''کیوں ایمان؟''اُس نے اچانک ہی کہا تو وہ حیران ہوئی۔ ''آئی مین (میرا مطلب)۔۔۔ آپ اتنی سمجھدار اور میچور لڑکی ہیں۔ آپ نے حسین جیسے لاابالی لڑکے کے لیے ہاں کیوں کی؟''کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس وقت اپنے منگیتر کو لاابالی کہنے پر اُسے ٹھیک ٹھاک سناتی۔ پر ایمان نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے، شاندار شخصیت کے مالک مرد کو دیکھا۔ وہ بے حد پڑھا لکھا، رکھ رکھاؤ والا اور بہت ٹھہری ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ پھر ایک نظر نگاہوں سے دور ہوتے حسین کو دیکھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا اظہر! کیا دیکھا تھا اُس نے حسین میں؟

جب وہ اُن دونوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، تب حسین نے یکدم ہی حور عین کا بازو پکڑا اور اُسے تیزی سے فوڈ کورٹ سے باہر لے آیا۔

''کیا ہوا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟''اُس نے اپنا بازو چھڑاتے غصّے سے کہا۔

''اظہر کے سامنے اس طرح کی حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''اُس نے خفگی سے پوچھا۔

''ایسا کیا کر دیا میں نے جو تم اس طرح سوال کر رہے ہو؟''وہ واقعی حیران تھی۔

''دیکھو حور! میری اور تمہاری بچپن کی دوستی اپنی جگہ پر اب تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ تمہارا اس طرح میرے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنا درست نہیں ہے۔''اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھانا چاہا۔

''تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟''اُس نے بھی سینے پر بازو باندھتے اُسے سنجیدگی سے دیکھا۔

''اظہر تمہیں بہت ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال سے اُسے تمہارا مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''میں اُسکی پسند ناپسند کی ذمّے دار نہیں ہوں۔'' اُس نے رکھائی سے کہا۔ شاید تھوڑی دیر پہلے کے اظہر کے رویے کا اثر تھا۔

''تم ذمّے دار ہو حور! وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔ تمہیں اُسکی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی میں کوئی اونچ نیچ ہو۔'' وہ اُسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا، اُسکی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ اسی لیے تو پسند تھا اسے وہ، اُسکے پاس ایک احساس کرنے والا دل تھا۔ اور وہ احساس کرنا جانتا تھا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ آنسو اندر اتارتی واپس پلٹ گئی۔

حسین اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

--------+---------+----------

گھر میں ایک طوفان مچ گیا تھا۔ آج مہندی کی رسم تھی، اور ایمان نے فون کر کے شادی سے نہ صرف انکار کیا تھا، بلکہ ڈھٹائی سے اظہر سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ایمان سے اس جرات کی کسی کو امید نہ تھی۔ حسین کو پتہ چلا تو وہ کتنی ہی دیر گنگ کھڑا رہا۔ بے شک، وہ اُس سے کوئی دلی لگاؤ نہیں رکھتا تھا، پر پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ اُسکی منگیتر تھی، اور پھر اُس نے ایمان کے احساسات و جذبات کا خیال کیا تھا، اُسکا دل نہیں توڑا تھا۔ پر اُس لڑکی نے کیا کیا؟ کتنے آرام سے اُس کے اوپر کسی اور کو فوقیت دے دی؟ ذرا دیر کو بھی نہ اُسکا سوچا نہ اپنے خاندان والوں کا۔ شام کو اس مسئلے پر بات کرنے کے لیے بڑوں کی مشاورت بیٹھی تھی۔

''تم نے کیا فیصلہ کیا پھر؟'' حسین کے ابّا نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

''مرتضیٰ بھائی! میں نے اظہر کی والدہ سے بات کی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور وہ رات کو رسم کے لیے آرہے ہیں۔'' اس بات پر حسین نے اچھنبے سے اُنہیں دیکھا۔

''چاچو! آپ نے اظہر سے بات کی؟ وہ کیا کہتا ہے؟'' حسین کے بھائی نے پوچھا۔

''نہیں! اظہر سے میری بات نہیں ہو سکی، وہ میرا فون نہیں اٹھا رہا۔ لینڈ لائن پر کیا تھا تو پہلے اُسکی والدہ نے ہی اٹھایا اور کہا کہ وہ کل سے دوستوں میں گیا ہوا ہے۔'' اس بات پر سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پر کہا کچھ نہیں۔

''چاچو! آپ انجان ہیں یا جان کر انجان بننا چاہ رہے ہیں؟'' اُس سوال پر اُنہوں نے ناپسندیدگی سے حسین کو دیکھا۔

''کیا مطلب ہے اِس بات کا؟''

''اظہر کا فون نہیں اٹھانا، اسی بات کی نشاندہی ہے کہ وہ حور سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ہمیں کیا حور کو اُسکے حوالے کرنا چاہیے؟'' حسین کے بجائے اُسکے بڑے بھائی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ کمرے کے باہر کھڑی حور عین نے ضبط سے آنکھیں میچی۔

''یہ تم لوگوں نے اپنی مرضی سے مفروضے قائم کر لیے ہیں؟ جب اظہر نے ایسا کچھ نہیں کہا، اور اُسکی ماں نے بھی اس بات کی تردید کر دی ہے، تو میں کیوں پریشان ہوں؟ حور کی شادی ہو گی اور اظہر سے ہی ہو گی۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''چاچو! کیا آپ اُس وقت تک انتظار نہیں کر سکتے، جب تک کہ اظہر کی جانب سے کوئی تصدیق یا تردید نہیں آ جاتی؟'' حسین نے کہا تو وہ غصّے سے کھڑے ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔

''تم یہ سب اِس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہاری منگیتر نے تم سے منگنی ختم کرنے کے لیے اظہر کا نام لے لیا ہے؟ اپنے ساتھ تم اور تمہاری وہ منگیتر، میری بیٹی کی زندگی بھی تباہ کرنا چاہتے ہو۔'' اُنکے الفاظ نے وہاں کھڑے ہر شخص کو حیران کر دیا تھا۔

''چاچو! چاچو۔۔۔ آپ اندھے ہو گئے ہیں اظہر کی دولت کے آگے، آپ دیکھ نہیں۔۔۔'' حسین نے اشتعال میں کہا اور اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر پڑا تھا۔

''اوقات میں رہو اپنی!'' وہ دھاڑے تھے۔

''چاچو!'' اُس نے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''حسین! یہ تم نے کس طرح بات کی ہے اپنے چچا سے؟ معافی مانگو فوراً!'' اُسکے ابّا نے فوراً اسے ڈانٹا تھا۔

''سوری!'' اُس نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر رک کر ایک نظر دور کھڑی حور عین کو دیکھا۔

''سوری حور!''اُسے بھی آہستہ سے کہااور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

''ابّو! آپ نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟''اگلے ہی لمحے روتی ہوئی حور عین کمرے میں داخل ہوئی اور تڑپ کر اپنے باپ سے بولی۔

''حور! تم خاموش رہو، تمہارا۔۔۔''

''نہیں ابّا! آپ بھلے میری شادی اظہر سے یا کسی بھی ایرے غیرے سے کروادیں، پر آپ نے حسین کو کیوں مارا؟ اُس کی بات پوری سننی چاہیے تھی آپ کو۔''وہ رونے لگی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں کو ہو کیا گیا تھا اچانک؟

''بس حور! جاؤاب یہاں سے۔''اُنہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

وہ رات حسین کے لیے بہت بھاری تھی۔ دوستوں کے ساتھ وہ مخلص تھا، پر انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ایمان کے ساتھ وہ مخلص تھا، اُس نے بھی ایک پل نہ سوچا اُسکا۔ وہ اُسکو کہہ سکتی تھی، اُسکے ساتھ شیئر کر سکتی تھی، اگر وہ پسند نہ تھا تو بتا دیتی، وہ خود اُسکے راستے سے ہٹ جاتا۔ چچا کے ساتھ وہ مخلص تھا پر انہوں نے کیا کیا؟ سب کے سامنے، سارے خاندان کے سامنے اسے تھپڑ مار دیا۔

سارا گھر حور کی مہندی کے فنکشن میں گیا ہوا تھا، پر وہ نہ گیا۔ اُسکی امی آئی تھیں اُسے بلانے، پر وہ نہیں آیا۔ انہوں نے بھی اسے اکیلے چھوڑ دیا۔ اظہر بھی مہندی میں نہیں آیا، ہاں پر اُسکے گھر والے سب آئے تھے۔ چچا کا دل جہاں اُنہیں دیکھ کر مطمئن ہوا تھا، وہیں اظہر کے غائب ہونے پر وہ مشکوک بھی ہوئے تھے۔

''اُسے ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑا ہے۔ کل تک آجائے گا۔''اُسکی والدہ سے سوال پوچھنے پر انہوں نے کہا تھا۔ چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔

مہندی کا فنکشن اپنے زوروں پر تھا۔ حسین الگ بخار میں تپ رہا تھا۔ حور عین کی خاموشی، حسین کی چچا سے بدمزگی اور اظہر کی غیر موجودگی نے تقریب کو جیسے سرد سا کر دیا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ دلہن بنے ہونے کے باوجود حور عین کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔

مہندی کا فنکشن بخیر وخوبی انجام پا گیا۔ اگلے روز نکاح ہونا تھا۔ حسین کمرے سے باہر ہی نہیں آیا، اُسکے گھر والے اُسکی وجہ سے الگ پریشان تھے۔ وہ بخار کی دوا کھا کر ایسا سویا کہ پھر کسی نے اُسے نہ اٹھایا۔ اُسکی تمام تر اوٹ پٹانگ حرکتوں کے باوجود بھی، پہلی بار اُسکے ابّا اُس سے متفق تھے۔ پر نظریں چرائے ہوئے تھے۔ حور عین اُنہیں بھی بہت پیاری تھی۔ پر وہ کیا کہہ سکتے تھے، جب اُنکا بھائی ہی کچھ سننے کو تیار نہ تھا؟

حور عین تیار بیٹھی تھی، دل الگ بے کل ہو رہا تھا۔ کل سے اُس نے حسین کو نہیں دیکھا تھا، وہ آخری بار اُسکا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔ حسین کی غیر حاضری پر کچھ کچھ اُسکے ابّو بھی اب شرمندہ نظر آرہے تھے۔ اُنہیں احساس تھا کہ انہوں بھی بہت غلط کیا ہے، اُسے اشتعال دلانے والے بھی وہ خود تھے۔ نکاح ظہر کے وقت تھا۔ پر لڑکے والے نہ پہنچے۔ فون کیا تو انہوں نے کچھ دیر انتظار کو کہا۔

دوسری جانب اپنے کمرے میں چت لیٹا حسین گھڑی کی سوئیاں دیکھ رہا تھا۔ ظہر کا وقت گزر چکا تھا۔ یقیناً حور کا نکاح ہو چکا ہو گا۔ اُس نے ضبط سے آنکھیں میچی۔ ظہر سے عصر کا وقت ہو گیا، یہاں تک کہ عصر گزر گئی اور مغرب کا وقت آنے لگا تو وہ پریشانی سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ لوگ آئے کیوں نہیں اب تک؟" اُس نے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُنکو فون کرتا، گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ جلدی سے دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اپنے گھر والوں کے منہ سے حور عین کے نکاح کے قصّے نہیں سننا چاہتا تھا۔

دروازہ کھل کر فوراً ہی بند کر دیا گیا۔ یعنی سب لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ یقیناً امی اور بھابھیاں حور کی طرف چلی گئی ہوں گی۔ اُس نے دل میں سوچا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ منٹ اسی طرح گزرے، پھر اُسے اپنے کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُسکے چار عدد بھائی کمرے کے دروازے پر دانت نکالے کھڑے، اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" اُس نے چہرہ اُٹھا کر حیرت سے پوچھا۔ اُن چاروں کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔

"اُٹھ جاؤ مجنوں کے کچھ لگتے۔۔۔" چاروں کمرے میں داخل ہوئے، اور اُسکے بڑے والے بھائی نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟" وہ جھنجھلا اٹھا۔

''مسئلہ تو اب ہو گا۔ تم نے کل جو بد تمیزی کی ہے نا چاچو کے ساتھ۔ اُسکی سزا ملنے کا وقت ہو گیا ہے۔'' اُسکے دوسرے نمبر والے بھائی نے اُسکی چادر کھینچی۔

''میں نے بد تمیزی کی؟ پر میں نے تو تھپڑ بھی کھا لیا تھا کل اُن سے، اُس پر سے معافی بھی مانگ لی تھی۔'' وہ شدید حیران ہوا۔

''ہاں! پر چاچو کی تسلی نہیں ہوئی، تمہیں مزید سزا دینی ہے۔'' اُسکے بڑے بھائی نے اسے زبردستی کھڑا کیا۔

''تو کیا کریں گے اب وہ کہ انکی تسلی ہو؟ گولی ماریں گے یا چوراہے پر لٹکا دیں گے؟'' وہ ناراضگی سے بولا۔

''یہ تو وہ ہی بتائیں گے۔ تم بس جا کر کپڑے بدلو۔'' اُسکے تیسرے نمبر والے بھائی نے اُسکا نکاح والا شلوار سوٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''دماغ خراب ہے؟ سزا جھیلنے کے لیے کپڑے بدل کر جاؤں؟ اور وہ بھی یہ نئے والے؟'' اسے اپنے بھائی کی عقل پر شک گزرا۔

''ساری دنیا سزا جھیلنے ایسے ہی جاتی ہے۔'' اُسکا سب سے بڑا بھائی بڑبڑایا۔

''چاچو کو یہیں لے آتے۔'' اسے کوفت ہوئی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہاں حور عین ہو گی اور وہ فلحال اُسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسکے بھائیوں نے مسکراہٹ دبا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''جا کر کپڑے بدلو! پھر سارے جواب مل جائیں گے۔'' اُسکے بھائی نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

''میں نہیں کرتا چینج، چلنا ہے تو ایسے ہی چلو۔'' وہ بھی ضدی لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

----------+---------+--------

''حسین!'' وہ ابھی گھر کے دروازے سے داخل ہی ہوا تھا کہ ابّا سامنے کھڑے نظر آئے۔ اسے دیکھ کر وہ اُسکی جانب بڑھے۔

''اسے ایسے ہی لے آئے؟'' اسے سیاہ ٹراؤزر پر کا ہی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے دیکھ کر اُسکی ماں نے اپنے دیگر بیٹوں سے پوچھا۔

''اس نے بات ہی نہ مانی!''اُسکا بھائی شرارت سے مسکرایا۔ جبکہ حسین توسب کی موجودگی کے باوجود وہاں چھائی عجیب سی خاموشی پر حیران تھا۔ حور عین سیڑھیوں کے برابر بنے جھولے پر خاموش بیٹھی تھی، جبکہ چاچو سامنے صوفے پر۔

''چھوڑوان سب باتوں کو، تم میرے ساتھ یہاں آؤ!''حسین کے ابّانے پہلے اپنی بیگم کواور پھراسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھراسے اپنے ساتھ لئے صوفے تک آئے۔

''آگیاہے یہ۔''اسے اپنے بھائی کے سامنے کھڑاکرکے،انہوں نے کہا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ سب کی نظریں اُن دونوں پر تھیں۔ اُسکے ابّا بھی بھائی کے برابرہی جابیٹھے۔

''چاچو!''حسین نے آہستگی سے پُکارا۔''میں جانتاہوں مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آئی ایم سوری! لیکن اگرپھر بھی آپ مجھے سزادیناچاہتے ہیں تو، میں سزابھگتنے کے لیے تیارہوں۔''اُس نے سرجھکائے شرمندگی سے کہا۔

''سزا؟ کونسی سزا؟''وہ حیران ہوئے۔ اُسکے بھائی پیچھے کھڑے کھی کھی کررہے تھے۔

''آپ نے ہی تویہاں مجھے سزادینے بلایاہے؟''اُس نے حیرت سے سراٹھاکردیکھا۔

''ناہنجار! میری بیٹی تمہیں سزالگتی ہے؟''چاچو کی جگہ اُسکے ابّانے غضبناک ہوکرجواب دیاتووہ مزید حیران ہوا۔

''بیٹی؟ آپکی بیٹی کب ہوئی؟''اُسکی زبان پھسلی تووہاں قہقہہ پڑا، جبکہ اُسکے ابّانے اپنی لاٹھی کھینچ کراسکی ٹانگوں پرماری۔

''آہ!''وہ بلبلااٹھا۔ سب لوگ ہنس رہے تھے اوروہ حیران ساپاؤں سہلاتاسب کودیکھ رہاتھا۔

''حورکی بات کررہاہوں میں، وہ میری بھی بیٹی ہے۔''انہوں نے کہا۔

''میری سزاکاحورسے کیاتعلق؟''وہ گڑبڑایا۔

''تم نے ہی تواسے سزاکہاہے۔''وہ غصّہ ہوئے۔

''مجھے سیدھے سیدھے بتادیں کہ چل کیارہاہے؟'' وہ جھنجھلااٹھا۔

''ہم تمہارا نکاح حور عین سے کروا رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض؟''اُسکے ابّا نے کہا۔

''میرا نکاح؟''اسے سمجھنے میں دیر لگی۔سب اُسکے تاثرات سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''اِس سے؟''اُس نے دور بیٹھی حور عین کی جانب اشارہ کر کے کہا، تو سب ایک بار پھر ہنسے۔

''کیا مطلب اِس سے؟ تمیز سے بات کرو!''امی نے ڈانٹا۔

''نہیں! میرا مطلب اظہر کا کیا؟''

''وہ کل ہی ایمان سے شادی کر چکا ہے۔اور آج نکاح کے لیے آنے سے قبل ہی اُسکی ماں نے فون کر کے یہ اطلاع دی ہے۔'' چاچو نے کہا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔''

''ہاں! تم نے ٹھیک کہا تھا۔''انہوں نے اعتراف کیا۔

''تو پھر مارا کیوں تھا مجھے؟''اُسکی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''مار تمہیں، تمہاری بکواس پر پڑی تھی۔''ابّا نے جواب دیا۔

''اچھا اب مذاق ختم کرو۔'' چاچو نے سب کو غیر سنجیدہ دیکھ کر کہا تو وہ خاموش ہوئے۔

''بیٹا! کل بارات ہے۔ہال وغیرہ بک ہیں۔رشتے دار بھی آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں بدنامی کا کوئی خوف نہیں ہے۔بدنام تو وہ ہوں جنہوں نے یہ حرکت کی ہے۔اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بہت پیسے ضائع ہوں گے۔اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ کل تم حور سے شادی کر لو۔ بارات اور ولیمے کے ہال اور کھانے کی جو پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے اس کا نقصان نہیں ہو گا۔'' چاچو نے چہرے پر مسکینیت سجاتے کہا تو وہ ہنسا۔

''تو چاچو اتنی بڑی سزا؟''اُس نے بھی مصنوعی دکھ سے کہا۔ تو ایک مرتبہ پھر لاٹھی اُسکے پاؤں پر پڑی۔اس مرتبہ حور عین بھی کھلکھلا کر ہنسی، تو اُس نے گھور کر دیکھا۔

''خبر دار! میری بیٹی کو ایسے مت گھورنا، ورنہ اور ماروں گا۔''ابّا نے دھمکی دی تو وہ سیدھا ہوا۔ محفل میں خوشیاں اُتر آئی تھیں جیسے۔

''دیکھو!''اب کہ ابّا سنجیدہ ہوئے۔''میں نے پہلے تمہاری منگنی اپنی مرضی سے ایمان سے کی تھی۔اُس نے جو کیا، وہ بہت غلط ہے، اسلیئے اس بار میں اپنی مرضی تم پر تھوپنا نہیں چاہتا۔اگر تمہیں حور عین سے شادی پر اعتراض ہے تو بتا دو۔ہم بالکل برا نہیں مانیں گے۔''انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکرایا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بزرگوں! سوائے اسکے کہ۔۔۔''وہ ڈرامائی انداز میں رکا۔

''کہ؟''سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

''میں ان کپڑوں میں نکاح نہیں کروں گا۔''اس نے اپنے رات والے حلیے پر نظر ڈال کر اپنے بھائیوں کو گھورا جو اسے سیدھی بات نہیں بتا سکتے تھے۔

''فکر نہ کرو، میں تمھارا سوٹ ساتھ لایا ہوں۔''اُسکے چوتھے نمبر والے بھائی نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

''ایک اور اعتراض ہے۔''اُس نے پھر ڈرامائی انداز میں کہتے دور بیٹھی حور کو دیکھا۔

''اب کیا ہے؟''ابّا کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔

''میں چار شادیاں کروں گا۔''کہتے ساتھ ہی وہ باہر بھاگا کیونکہ اس نے ابّا کو جوتا اٹھاتا دیکھ لیا تھا۔

----------+---------+--------

''اور یوں، ہماری شادی ہو گئی۔''علی کی لائی گئی پیکٹ والی مونگ پھلی کا دانہ منہ میں ڈالتے اُس نے قصّہ مکمل کیا تھا۔سب منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔یہ کتنا بڑا چھپا رستم تھا؟

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''سب کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اُس نے پوچھا۔

''تمہاری زندگی بھی تمہاری طرح مضحکہ خیز ہے۔''یہ تبصرہ علی کی جانب سے آیا تھا، جس نے سب کے چہروں پر تبسم بکھیرا تھا۔

''زندہ دل لوگ ہیں بھئی! مسائل دل سے لگا کر نہیں بیٹھتے۔'' وہ چادر اپنے گرد لپیٹتے بولا۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔

''یہ تو ہے۔'' عمر نے اعتراف کیا۔

''چلو! تمہاری کہانی سن کر وقت اچھا گزرا۔'' مقدّم نے انگڑائی لیتے تبصرہ کیا۔ فجر ہونے والی تھی۔

''تو ایمان کبھی ملی نہیں تمہیں دوبارہ؟'' رضا نے اچانک پوچھا۔

''شوق تو مجھے بڑا تھا کہ کبھی واپس آئے، تو میں اُس سے پوچھوں کہ بی بی اگر تمہیں جانا ہی تھا تو پہلے ہی بتا دیتی، میرا فضول کا خرچہ کروایا۔ اُسکی شادی کا لہنگا میں نے اپنے جمع شدہ پیسوں سے لیا تھا۔ وہ بھی واپس نہیں کیا اس نے۔'' اُس کے غم بھی نرالے تھے۔ وہ لوگ ہنسے۔۔۔

''ہنسو مت! اظہر کی ماں تو واپس لے گئی تھی اپنا دیا ہوا لہنگا، حور کے لیے بھی مجھے پیسے ضائع کرنے پڑے۔'' اُس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ (صاف اداکاری!)

''تمہارے ساتھ بالکل صحیح ہوا۔'' علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پر ایمان جو اظہر کے ساتھ ملک سے باہر گئی تو پھر واپس ہی نہیں آئی۔ شاید شرمندگی کی وجہ سے۔۔۔ ایک بار آتی تو میں شکریہ ضرور ادا کرتا اُسکا۔'' اُس نے پیکٹ میں رکھی آخری مونگ پھلی بھی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اُسکا شکریہ کس لیے؟'' عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ انکار نہ کرتی تو حور کیسے ملتی مجھے؟'' اُس نے مزے سے کہا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھری۔۔۔ اس مرتبہ ایس ایس پی صاحب کے چہرے پر بھی!۔ رضا نے آسودگی سے مسکراتے اُسے دیکھا، پھر چہرہ جھکا لیا۔

''پہلا آدمی ہے جسے دنیا میں حور مل گئی ہے۔ اسکو جنت میں حوروں کی ضرورت نہیں ہو گی۔'' مقدّم نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

''ایک منٹ!۔۔۔ ایک منٹ!۔۔۔ یہ کس نے کہا تم سے؟'' حسین نے سنجیدگی سے پوچھا تو ایک بار پھر وہاں ہنسی کا دور چلا۔

''نہیں! یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے، جنت والی حوریں جنت والی ہوتی ہیں۔اُنکو نہیں ٹھکرانا چاہیے۔۔۔'' وہ سمجھداری سے کہہ رہا تھا اور محفل کشت زعفران بن چکی تھی۔

----------+---------+--------

سورج نکلنے کے بعد ایک مرتبہ پھر جی کڑا کر کے وہ واپسی کے لیے نکلے۔ایک مرتبہ پھر سے دشوار راستوں کا سفر کر کے وہ لوگ جب حویلی واپس پہنچے تو فیو میگیشن کی ہلکی ہلکی بو سارے میں موجود تھی۔اکرم نے کھانے کا انتظام کر دیا تھا لیکن وہ لوگ تھک کر جو سوئے تو رات کو ہی جاگے تھے۔اکرم کا لایا کھانا رات کو کام آ گیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد سب ایک مرتبہ پھر اپنے اپنے کمروں میں موجود تھے، حویلی سے اُنہیں ایک عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔وہ جیسی بھی تھی، کم از کم اس دو کمرے کے ڈربے جیسے گھر سے تو اچھی ہی تھی۔پہاڑوں کا اتنا لمبا پیدل سفر کر کے اُنکی ٹانگوں کا جو حال ہوا تھا، اُسکے بعد اُن میں سے کوئی بھی کم از کم آج کی رات تو باہر نہیں نکلنے والا تھا۔

''پیر کیسا ہے تمہارا؟'' اپنے کمرے میں رضا نے برابر والے پلنگ پر نیم دراز علی کو دیکھتے ہوئے پوچھا، جسکا دایاں پاؤں اب بھی سوجا ہوا تھا، وہ اسے ایک کشن پر رکھے نیم دراز تھا۔

''ویسا ہی ہے جیسا سب کا ہوتا ہے۔'' اُس نے جواب دیا تو رضا نے سر تا پاؤں اسے گھورا۔

''مار لیا جوک؟'' اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''دیکھ ہی رہے ہو تم کیسا ہے؟'' علی نے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔خود ہلنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رضا نے یہاں وہاں دیکھتے پیشکش کی۔ علی نے آنکھیں چھوٹی کر کے بغور اسے دیکھا۔وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا، اب پیشکش کر ہی دی تھی تو براہِ راست بات بھی کر لیتا۔

''واقعی میں؟'' اُس کی آنکھیں شرارت سے چمکی۔

''ہاں! اتنا برا آدمی نہیں ہوں میں۔انسانیت ہے میرے اندر۔'' اُس نے پھر دیواروں پر بنے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ایک کام کرو پھر، مجھے سامنے، جگ سے پانی نکال کر دے دو گلاس میں۔''اُس نے بنا کسی لحاظ کے آرڈر دیا تو اب کہ رضا نے براہِ راست اسے دیکھا بلکہ گھورا۔

''انسانیت؟''اسے خود کو گھورتا پا کر علی نے یاد دلایا تو وہ دانت کچکچاتے اٹھا اور میز پر رکھے جگ میں سے پانی نکال کر اسے لا کر دیا۔

''اوہ! وہ میری درد کی دوائی بھی وہیں رکھی ہے۔دے دینا ذرا!''علی نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو اُس نے ضبط کے گھونٹ بھرے اور دوبارہ میز تک آیا، پھر اُسکی مطلوبہ دوا نکال کر اُسے لا کر دی۔

''شکریہ!''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو رضا اُسے گھورتا ہوا واپس اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

''رکو رکو!''علی نے فوراً کہا تو وہ پلٹا۔

''کیا؟''

''یہ واپس کون رکھے گا؟''اُس نے گلاس اور دوا کے پتّے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ رضا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ فوراً بولا۔

''انسانیت؟''وہ کڑے تیوروں سے گھورتا اُسکے پاس آیا، پھر گلاس اور دوا اس سے تقریباً چھینتا ہوا واپس لے گیا۔ پھر اپنے بستر پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ

''یہ ہیٹر ذرا کم کر دو، اور یہ والی لائٹ بھی بند کر دینا، میری آنکھ پر پڑ رہی ہے۔''اُس نے چہرے پر معصومیت سجاتے، شیطانیت سے کہا۔

''انسانیت۔۔۔''اسے منہ کھولتے دیکھ کر پھر یاد دہانی کروائی۔ وہ خون کے گھونٹ بھرتا اُٹھا اور غصّے سے ہاتھ مار کے لائٹ بند کر کے واپس آیا۔

''ہیٹر بھی کہا تھا۔''علی نے یاد دلایا۔

''بھاڑ میں گئی انسانیت۔۔۔''رضا غصّے سے بولا اور لحاف سر تک تانے لیٹ گیا۔ لحاف کے اندر سے اُسکی بڑبڑانے کی آواز واضح تھی۔ علی ہنستا رہ گیا۔

دوسری جانب اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹتے حسین کی آنکھ کھڑکی کی آواز سے کھلی تو اُس نے نیم بیداری میں پلٹ کر دیکھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بند کھڑکی کے پٹ ہلے تھے۔ اُس نے جمائی لیتے کروٹ بدلی تو نوید کا پلنگ خالی پایا، وہ غائب تھا۔ پہلے تو اُس نے نظرانداز کیا، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر پورا ہی بیدار ہو بیٹھا۔ نوید تو کمرے میں آیا ہی نہیں تھا۔ اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے تین بج چکے تھے۔ نوید اتنی دیر سے کہاں تھا؟ وہ متجسس ہوا۔

نوید ہمیشہ اُسکے سونے کے بعد سوتا تھا، اور اُسکے اٹھنے سے پہلے جاگ جایا کرتا تھا۔ یا شاید وہ سوتا ہی نہیں تھا، اور اگر سوتا بھی تھا تو معلوم نہیں کب؟ حسین نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس نے پیروں میں چپل ڈالی، پھر پلنگ کے سرہانے لٹکا اپنا جیکٹ اٹھا کر پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری ہمیشہ کی طرح سنسان پڑی تھی۔ وہ ابھی راہداری میں ہی تھا کہ اسے اپنے کمرے کے برابر والا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے آج تک اِس دروازے کو بند دیکھا تھا، وہ اسے کوئی کمرہ ہی سمجھتا تھا۔ پر وہ ایک راہداری کا دروازہ تھا۔ ایک اور طویل راہداری۔۔۔

”کتنی راہداریاں ہیں اس حویلی میں؟“ وہ حیران ہوتا دروازے سے اندر راہداری میں داخل ہوا۔ طویل راہداری میں دونوں جانب دیواروں پر پرانے وقتوں کے اسلحے سجے تھے۔ چھت پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پیلی ایل ای ڈی بلب جل رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا، اسے یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ راہداری کے اختتام پر کیا ہے؟

جیسے ہی راہداری ختم ہوئی، اُسکی آنکھیں حیرت سے پھٹیں اور منہ **اوہ** کے انداز میں کھلا تھا۔ وہ ہال نمبر دو کی پہلی منزل پر کھڑا تھا، سامنے ہی ریلنگ تھی، جس سے نیچے ہال نمبر دو نظر آرہا تھا۔ تو یہ دروازہ ہال نمبر ایک کی پہلی منزل کو حال نمبر دو کی پہلی منزل سے جوڑتا تھا۔ وہ پچھلے دو روز سے یہ سمجھ رہا تھا کہ ہال نمبر دو، جہاں تمام قسم کی چیزیں موجود تھیں، وہاں تک جانے کے لیے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آنا ہوگا اور پھر سیڑھی کے دائیں طرف والے دروازے سے اندر جانا ہوگا، اب اس راہداری کو دیکھ کر، وہ اس حویلی کو تخلیق کرنے والوں کی کاریگری پر عش عش کر اٹھا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ریلنگ تک آیا اور دونوں ہتھیلیاں اُس پر ٹکا کر نیچے جھانکا اور اُسی لمحے ساکت رہ گیا۔ نیچے ہال میں ایل ای ڈی بلب کی مدھم روشنی میں، ایک کونے پر نیم واضح سا نوید عالم جائے نماز بچھائے، حالت قیام میں تھا۔ وہ یقیناً تہجد پڑھ رہا تھا۔

اسے یاد آیا کہ آج یوم عرفہ شروع ہو چکا تھا۔پرسوں عید بھی تھی۔ حسین خاموش سا اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، یہاں تک کہ پندرہ سے بیس منٹ گزر گئے۔اُسکا قیام طویل ہو گیا۔ حسین کو حیرت ہوئی، نوید حافظ نہ تھا، پھر اتنا لمبا قیام کیسے ؟ حتّٰی کہ آدھا گھنٹہ گزر گیا، تب کہیں وہ رکوع میں گیا، اُسکا رکوع بھی لمبا تھا۔ پھر کھڑا ہوا، پھر سجدے میں گیا تو اسکا سجدہ بھی اتنا ہی لمبا ہو گیا جتنا کہ قیام۔ حسین کچھ عقیدت اور کچھ حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔اس نے تقریباً ایک گھنٹہ لگا کر ایک رکعت مکمل کی، پھر دوسری رکعت میں کھڑا ہو گیا۔ حسین خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

نوید عالم کو وہ لوگ کبھی نہ سمجھ پائے تھے۔۔۔

نہ کل۔۔۔۔

نہ آج۔۔۔

--------+---------+----------

اُس روز کافی دنوں بعد وہ لوگ ناشتے کی میز پر پہلے سے زیادہ تروتازہ اور بہتر محسوس کر رہے تھے۔ناشتہ بنانے کی ذمہ داری نشمیہ کے باپ کی تھی، جسے آملیٹ بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ لہٰذا اُس نے آج صرف ڈبل روٹی کے ٹوسٹ بنائے، مکھن اور جیم رکھا، چائے عمر سے بنوائی اور بس ! بن گیا اُسکا ناشتہ۔۔۔

''اس دو کمروں کے گھر کے فرش پر رات گزارنے کے بعد مجھے حویلی کی قدر ہو گئی ہے۔'' ناشتے کی میز پر حسین نے کہا تھا۔

''وہ بھی کوئی گھر تھا؟'' مقدّم نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ! اُس سے اچھا تو تمہارے دادا کا گھر تھا۔'' عمر اچانک ہی بولا۔

''وہ جو سوات میں تھا؟'' حسین نے پوچھا تو ڈبل روٹی پر مکھن لگاتا، مقدّم کا ہاتھ تھما۔

''ایک منٹ !۔۔۔ تمہیں کیسے پتہ کہ میرے دادا کا گھر سوات میں ہے ؟'' ڈبل روٹی کا ٹکڑا حسین کے حلق میں اٹکا۔

''تم نے ہی تو بتایا تھا۔'' اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ بھی نہیں بتایا تمہیں۔'' مقدّم نے بھنویں اچکاتے اُسے دیکھا۔

''بتایا تھا! یاد کرو۔۔۔اس دن۔۔۔'' وہ ڈھیٹ بھی بضد تھا۔

''ہاں ہاں! کس دن؟'' اُس نے دونوں بازو سینے پر باندھتے اُسے گھورا۔

''آں۔۔۔ہاں! یاد آیا۔'' اُس نے یاد آنے کی اداکاری کی۔ ''نوید نے بتایا تھا۔'' اُس نے قریب بیٹھے نوید کی جانب اشارہ کر کے کہا، جو بے نیازی سے ڈبل روٹی پر آدھا مکھن اور آدھا جیم لگا رہا تھا۔ اس بات پر اُس نے آبرو اٹھا کر ایک نظر سنجیدگی سے حسین کو دیکھا۔

''اور نوید کو کس نے بتایا کہ میرے دادا کا گھر سوات میں ہے؟'' مقدّم کا رخ نوید کی طرف ہوا، جبکہ ڈبل روٹی کو دانت سے کترتے، رضا کے لیے نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔

''میں نے اسے نہیں بتایا۔'' مختصر جواب دیتے نوید نے چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔

''یعنی تمہیں معلوم ہے؟ کیسے معلوم ہے؟'' مقدّم نے اُسکے الفاظ پکڑے تو نوید نے چائے کی پیالی میز پر رکھی، اور سینے پر بازو باندھ کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔ وہ سربراہی کرسی پر تھا، اُسکی دائیں جانب حسین اور بائیں جانب والی کرسی پر مقدم تھا۔

''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارے دادا نے دو شادیاں کر رہی تھیں، اور تیسری شادی وہ اپنی جوانی کی سابقہ منگیتر سے کرنے والے تھے کہ تمہاری دونوں دادیوں نے انکے خلاف محاذ کھڑا کر لیا اور وہ دل کے عارضے میں مبتلاء ہو کر دنیا سے چلے گئے۔ پر میں نے۔۔۔ان میں سے کچھ بھی۔۔۔اسکو نہیں بتایا۔'' نوید نے آخری جملہ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔ جبکہ مقدّم کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا تھا۔

''تمہارے دادا تو بڑے رنگین مزاج تھے۔'' حسین نے ہنستے ہوئے کہا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔

''آخر تم لوگ میرے دادا کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

''اوکے اوکے!'' حسین نے صلح جو انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ ''مجھے رضا نے بتایا تھا۔'' اب کہ اُس نے سچ بتایا۔

''رضا کو کیسے معلوم؟'' وہ حقیقتاً چڑا۔

''اس روز تم اور عمر رات کو کچن میں تھے نا؟ تب میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔'' رضا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''شرم نہیں آئی تمہیں؟'' مقدّم نے افسوس سے کہا۔

''نہیں! تم دونوں اتنی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے کہ راہداری میں سب واضح سنائی دے رہا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''ایک تو باتیں سنیں، اوپر سے حسین کو بتا بھی دیں۔'' عمر نے بھی اسے شرم دلانے کی کوشش کی پر اسے رتی بھر فرق نہ پڑا۔

''تم دونوں رات کو کچن میں کر کیا رہے تھے؟'' نوید نے یکدم ہی عمر اور مقدم سے پوچھا۔

''یہ دونوں، کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ، کچھ بھی کرتے ہوئے پائے جا سکتے ہیں اور وہ بھی ایک ساتھ!'' یہ بے لاگ تبصرہ علی نے کیا تھا، جس پر رضا اور حسین ایک ساتھ ہنسے تھے۔ عمر اور مقدم نے البتہ اسے سنجیدگی سے گھورا تھا۔

''آئی ایگری (میں مانتا ہوں۔)'' حسین نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم چائے بنا رہے تھے۔'' عمر نے اپنا مشکوک ہوتا کردار صاف کرنا ضروری سمجھا، اس لیے فوراً نوید کو بتایا۔

''اور رضا کیا کر رہا تھا وہاں؟'' اب کہ نوید نے رضا سے پوچھا۔ ایس ایس پی صاحب کا خالص تفتیشی انداز!

''میں اصل میں۔۔۔'' وہ جو بتانے ہی لگا تھا، اپنے سامنے بیٹھے علی کو مسکراتا دیکھ کر یکدم ہی رکا۔ کیا ہی مزہ آئے جو اگر اسکے مسکراتے چہرے کو خراب کر دیا جائے؟

''اصل میں، جتنی چرس، افیم، آئس اور جتنے بھی قسم کے نشے میں ساتھ رکھ کر لایا تھا، وہ ختم ہو گئے تھے۔ تو سوچا جا کر کچن میں دیکھ لوں، کیا معلوم اتفاقاً کہیں کچھ مل ہی جائے۔'' اُس نے مزے سے کہا تو جہاں اب باقی تینوں بیساختہ ہنسے تھے، وہیں علی کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔ اُسکا موڈ غارت ہو گیا؟ ہٹس آف ٹو رضا! نوید البتہ ان تمام صورتحال میں سنجیدہ تھا۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں مجھے ہر بات میں گھسیٹ لیتے ہو؟'' حسبِ توقع علی چڑا تھا۔

''میں نے کب تمہارا نام لیا؟ میں نے تو تمہارا ذکر بھی نہیں کیا؟ کیا میں نے کیا؟'' اُس نے انجان بننے کی انتہا کرتے ہوئے برابر بیٹھے عمر سے پوچھا۔

''نام نہیں لیا پر ذکر میرا ہی کیا۔'' علی کی بھی آج بس ہو گئی تھی۔

''واللہ! میں نے تمہیں ایک لفظ نہیں کہا۔ بلا وجہ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔''اُس نے مظلوم بننے کی انتہا کی۔

''میں الزام لگا رہا ہوں؟ اور جو تم کر رہے ہو؟''علی نے اُسکی ساری مظلومیت نکال کر اُسکے ہاتھ پر رکھی۔

''ہاں! تم الزام لگا رہے ہو۔ اور تم ہمیشہ یہی تو کرتے ہو۔ کبھی کہتے ہو میں نشہ کر رہا ہوں، کبھی کہتے ہو میں کھائی میں چھلانگ لگانے والا ہوں، اب کہہ رہے ہو کہ میں ہر گفتگو میں تمہیں گھسیٹ لیتا ہوں۔ صرف ایک قتل کا الزام ہے جو اس آدمی نے میرے اوپر نہیں لگایا۔۔۔ باقی ہر طرح سے میں ہی مجرم ہوں۔''رضا نے ایک مرتبہ پھر عمر کو دیکھتے ہوئے کہا جو اُسکی بکواس پر مسکرا رہا تھا۔

''تمہاری مشکوک حرکتوں کو دیکھ کر کوئی بھی وہی کہے گا جو میں کہتا ہوں۔ الزام کہاں سے ہوا یہ؟''علی نے بھی آج غلطی نہ ماننے کی قسم کھائی تھی۔

''تمہارے علاوہ تو کوئی بھی یہ سب نہیں کہتا؟ کیا تم سب میرے بارے میں ایسا سوچتے ہو؟''رضا نے ایک بار پھر سب کو گھسیٹا۔

''ہاں! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔ معلوم ہے تم کتنے اچھے ہو۔۔۔''علی نے ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔

''بس کرو تم دونوں!''نوید نے غصّے سے میز پر چمچ پٹخا تھا۔ وہاں یکدم ہی خاموشی چھائی، سب نے ایک ساتھ اُسکی جانب دیکھا جسکا پارہ غالباً آسمان چڑھ چکا تھا۔

''تم دونوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے سوائے ایک دوسرے سے لڑنے کے؟ سر میں درد کر کے رکھ دیا ہے۔''وہ غصّے سے کہتا کرسی گھسیٹ کر اٹھا اور وہاں سے واک آوٹ کر گیا۔ سب کی نظروں اور گردنوں تک نے دور تک اُسکا پیچھا کیا، پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہم تو مذاق کر رہے تھے۔''سب سے پہلے رضا نے کہا۔

''ہاں واقعی! میں سیریس (سنجیدہ) بالکل نہیں تھا۔''علی نے بھی تائید کی۔

''میں بھی انجوائے کر رہا تھا۔''عمر نے معصومیت سے کہا۔

''تو پھر اِسکو کیا ہوا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''اِسکے اندر کا والد، جسے ہم نے سلا دیا تھا وہ پھر سے جاگ گیا ہے۔ اِسکی عقل ٹھکانے لگانے کا وقت ہے۔'' حسین نے بتایا تو سب نے اُسکی تائید میں سر ہلایا تھا۔

جبکہ لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر سیگریٹ پیتا نوید خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ اُسے اچانک سے کیا ہوا تھا؟

----------+---------+--------

رات وہ لوگ حویلی کے باغ میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو، اور سردی کی مہک آپس میں مل جل کر ایک نئی خوشبو پیدا کر رہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے باغ کو لپیٹے میں لے رکھا تھا۔ حویلی کے احاطے سے باہر دیو قامت پہاڑ اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ کل عیدالاضحیٰ تھی اور انکے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔

نوید کے علاوہ سب وہاں موجود تھے۔ وہ لوگ جس طرف رخ کیے بیٹھے تھے، اُس طرف حویلی کی شیشے کی محرابی کھڑکیاں تھیں، جس سے اندر ہال میں بیٹھے نوید کو واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی برقرار تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے کھلے تھے۔ اگر اونچی آواز میں بات کی جاتی تو رات کے سناٹے کے باعث اندر بیٹھا شخص بخوبی سن سکتا تھا۔

''یہ کیا ناراض ہو گیا ہے؟'' کرسیوں پر دائرے کی صورت اُن سب کے ساتھ بیٹھے رضا نے، سامنے ہال میں بیٹھے نوید کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

''شاید!'' مقدّم نے کہا۔

''تو کیا ہمیں اسے منانا چاہیے؟'' سوال عمر نے کیا تھا۔

''نہیں! کیوں؟'' علی نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ اُن لوگوں نے دہل کر اور اندر بیٹھے نوید نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''وہ کیا ہمارا ابڑا ہے؟ یا کوئی بزرگ ہے جو اُسکو منانا ہم پر فرض ہے؟'' اُس نے آواز بلند رکھتے ہوئے ہی بات مکمل کی۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ بالکل! صحیح کہہ رہے ہو۔'' مقدّم نے بھی باآواز بلند اُسکی تائید کی۔ نوید جو کوئی فائل کھولے بیٹھا تھا، اُس نے زور سے فائل بند کی اور کھڑا ہوا۔ پانچوں کی بولتی بند ہوئی۔ اور پھر سب نے اُسے دائیں طرف والی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا، آگے شیشے کی دیوار کے اُس پار، وہ راہداری پار کر کے ڈائننگ ہال اور پھر باورچی خانے میں گم ہوتا نظر آیا تھا۔

''یہ لان کتنا اچھا ہے، یہاں سے بیٹھ کر پوری حویلی کے اندر نظر رکھی جاسکتی ہے۔'' حسین نے تعریف کی۔

''پوری حویلی نہیں، فقط ہال نمبر ایک، اور یہ ڈائننگ ہال والی راہداری۔'' عمر نے تصحیح کی۔

''چھوڑدوان سب باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ یہ باورچی خانے میں گیا کیوں ہے؟'' رضا نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''کہیں کوئی خنجر یا چھرا وغیرہ لینے تو نہیں گیا۔'' علی نے بھی تشویش سے پوچھا۔

''تمہیں ہی شوق تھا نہ اتنا چلا چلا کر بولنے کا۔'' رضا نے کہا۔

''تم جب بھی نوید کی برائی کرتے ہو، وہ ضرور سن لیتا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''ہاں تو! میں ڈرتا تھوڑی ہوں اُس سے۔'' اُس نے کہا۔

''میں تھوڑا تھوڑا ڈرتا ہوں، یہ بندے اٹھا اٹھا کر پٹختا جو ہے۔'' حسین نے ڈرنے کی اداکاری کی تھی۔ اُسی لمحے باورچی خانے سے منسلک باغ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی جو یہاں سے نظر نہیں آرہا تھا، تاہم یہ سب کو معلوم تھا کہ یہ اُسی دروازے کی آواز ہے۔ کچھ ہی سیکنڈ بعد نوید ایک ہاتھ میں موبائل، اور ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھامے ٹریک پر چلتے، وہیں آتا دکھائی دیا تو سب کے منہ حیرت سے کھلے۔ چھے عدد پیالیوں والی وہ ٹرے، اُسکے جنّاتی سائز کے ہاتھوں میں چھوٹی لگ رہی تھی۔ وہ موبائل پر کچھ اسکرول کرتا وہاں پہنچا، اور اُنکی کرسیوں کے درمیان رکھی، چٹائی سے بنی میز پر ٹرے رکھ دی۔ خود وہ رضا کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ دائرہ مکمل ہو گیا۔

''یہ کس خوشی میں؟'' مقدّم نے مشکوک انداز میں آنکھوں سے چائے کی جانب اشارہ کر کے اُس سے پوچھا۔

''اپنے لیے بنا رہا تھا، تو تم لوگوں کے لیے بھی بنادی۔'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''جج ورگر یو یاد ہے تمہیں؟'' حسین نے سرگوشی کے انداز میں مقدم سے کہا، البتہ یہ ایک واضح سرگوشی تھی۔

''بس کردو! اس نے ہمیں مارنا ہوتا تو کب کا مار چکا ہوتا۔'' رضا نے کہا۔ نوید نے نظر انداز کرتے نظریں موبائل پر مرکوز رکھیں۔

''ایک بات بتاؤ نوید! تمہیں ڈر نہیں لگتا؟'' حسین کو جیسے کچھ یاد آیا تو پوچھا۔ اب وہ آ ہی گیا تھا تو گفتگو میں اسے حصّے دار بنانا فرض تھا۔

''کس سے؟'' اُس نے موبائل پر سے نظریں اٹھا کر اس سے پوچھا۔

''بندوق کی گولی سے؟ کتنی گولیاں کھا چکے ہو اب تک؟'' سوال مقدّم نے مکمل کیا۔

''پتہ نہیں! مجھے یاد نہیں۔ ایک آدھ تو سب ہی کو لگ جاتی ہے سروس کے دوران۔'' اس نے کندھے اُچکا کر کہا، جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

''تو؟ ڈر نہیں لگتا؟ کبھی ایسی ہی کوئی اندھی گولی موت کا سبب بن گئی تو؟'' عمر نے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ کوئی تمہیں مارنے والا ہے؟ کیا تم لوگ ڈر رہے ہو؟ کیا موت کا خوف نہیں آ رہا؟'' اُس نے الٹا سوال کیا۔

''اب عادت ہو گئی ہے، خوف ختم ہو گیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''بالکل! ایسا ہی ہے۔ گولیوں کی آواز سننے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس لیے خوف ختم ہو چکا ہے۔ ویسے بھی، موت اگر میدان جنگ میں ہوتی، تو خالدؓ کبھی بستر پر نہ مرتے۔ (~حضرت خالد بن ولیدؓ)'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ پانچوں متاثر نظر آنے لگے۔

''خیر! میں یہ بتانے آیا تھا کہ جون کی چھ تاریخ قریب ہے۔ ایف آئی نے تم سب کے گھر والوں، اور گھر کے اطراف میں سیکیورٹی سخت کر دی ہے۔ گو کہ کوئی قابلِ ذکر مشکوک سرگرمی یا انسان دیکھنے کو نہیں ملا ہے، پر دیکھتے ہیں! اس دن مجرم پر اُسکی چال الٹتی ہے تو وہ بوکھلاہٹ میں کیا کرتا ہے؟ چھے تاریخ کو جو بھی ہو، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ واپسی تم لوگ فرّخ صاحب کے پاس جاؤ گے، وہ بتائیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے؟'' اُس نے تفصیل سے کہا۔

''یعنی! ہم واپس گھر نہیں جائیں گے؟'' علی نے پوچھا۔

''فلحال نہیں! پہلے فرّخ صاحب کے پاس ہی جانا ہو گا۔ اپنی واپسی کے متعلق اپنے گھر والوں کو کسی قسم کا کوئی عندیہ نہ دینا۔ '' اس نے کہا تو وہاں کچھ دیر کی خاموشی چھا گئی۔ واپسی کے نام پر کچھ ملی جلی سی کیفیت تھی، جسے فلوقت کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

''ایک بات بتاؤ نوید!'' حسین کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تو نوید سے پوچھا۔

''ہونہہ؟'' اُس نے موبائل پر کچھ لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں کہا۔

''یہ تم نے ہماری معلومات کس خوشی میں اکھٹی کرر کھی تھی؟ کیا تم ابھی بھی ہماری معلومات رکھتے ہو؟'' حسین نے باز نہیں آنا تھا۔ سب ہی نے اسے گھورا تھا۔ نوید نے موبائل بند کر کے جیکٹ کی جیب میں ڈالا اور اُسکو دیکھا۔

''میرا پیشہ ہے یہ!''

''ہماری معلومات اکھٹی کرنا؟''

''نہیں! اُس وقت، جب یہ کیس میرے ہاتھ میں آیا تو مجھ تک تم لوگوں کی تمام معلومات پہنچی ہی تھی۔ جس نے مقدم کے آبائی علاقے میں جا کر اُسکے متعلق معلومات اکھٹی کی تھیں، اسی نے اِسکے دادا کے بارے میں بتایا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، پر یہ اچھا تھا کہ مکمل بات کر رہا تھا۔ گفتگو میں حصہ لے رہا تھا، یا شاید حسین اسے گفتگو کا حصّہ بنا دیتا تھا، چاہے اُسکی مرضی ہو یا نہیں!

''کافی مشہور تھے تمہارے دادا؟'' حسین نے تبصرہ کیا تو مقدّم نے گھورا۔

''مجھے کیس ختم ہونے تک تم لوگوں کی تمام حرکات و سکنات کی خبر ملتی رہیں گی۔ یہ صرف اس کیس تک ہے، جس دن یہ کیس مکمل ہوا، اُس دن تم لوگ جو بھی کرو۔ اس سے مجھے یا ایف آئی اے کو کوئی غرض نہیں رہے گی، پر فلحال! تم لوگوں کی معلومات رکھنا میرے کام کا حصّہ ہے۔'' اُس نے صاف گوئی سے سب بتایا۔ اور اِس سے پہلے کہ کوئی بھی، کسی بھی قسم کا تبصرہ کرتا، نوید نے براہِ راست اپنے برابر بیٹھے رضا کو سنجیدگی سے دیکھا۔

''اور اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ جو کچھ تم کرتے پھر رہے ہو، اُسکی مجھے خبر نہیں ہے یا میں انجان ہوں۔ تو۔۔۔ تم بہت بڑے احمق ہو۔'' چائے کی پیالی رضا کے منہ سے لگی اور۔۔۔ لگی ہی رہ گئی، زبان جل چکی تھی۔ اُس نے یہ کیا کہا تھا؟ اور کیوں؟ پر نوید نے باقی سب کو دیکھ کر گفتگو جاری رکھی، جیسے وہ تو سب ہی سے مخاطب تھا۔

''میں اپنے آس پاس نظر رکھتا ہوں۔'' اُس نے گفتگو سمیٹی تھی۔ کوئی سمجھا نہ سمجھا پر رضا کو بڑے اچھے سے سمجھ آ گئی تھی۔

''فاتحہ پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے بیٹا!'' چونکہ حسین، رضا کے برابر ہی تھا،اِس لیے فوراً سے بیشتر سر گوشی کرنا ضروری سمجھا۔

''تم لوگ اپنا سامان اب باندھنا شروع کر دو، ہمیں بہت جلد یہاں سے نکلنے کا حکم مل جائیگا۔'' نوید نے کہا اور چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوا۔ پھر کسی کی بھی طرف دیکھے بنا اندر چلا گیا، اب وہ لوگ شیشے کی کھڑکی کے پار نظر آتے ہال میں اُسے بیٹھے، اپنے سابقہ کام میں مشغول دیکھ سکتے تھے۔ اُسکے جانے کے بعد مقدّم موبائل میں کچھ دیکھنے لگا۔ عمر اور علی اپنے آفس کے متعلق کچھ ڈسکس کرنے لگے۔

''کیا ہوا؟'' حسین نے سرگوشی کے سے انداز میں رضا سے پوچھا، جسکی نظریں ہال میں بیٹھے نوید پر ہی تھیں۔

''یہ کیا کہہ کر گیا ہے ابھی؟'' رضا نے صدماتی انداز میں پوچھا۔

''جو تم نے سنا۔ کیا اسے معلوم ہے؟'' حسین نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ!'' بے بسی سے کہتے رضا نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ حسین کو کیسے معلوم؟

''اگر اُسے معلوم ہوا تو؟'' حسین نے پھر پوچھا، تو اُس نے تھوک نگل کر نوید کو دیکھا۔ نظروں کے سامنے ایس ایچ او سمیر کی خنجر گھونپی گئی آنکھ آ گئی۔

آؤچ! اُس نے فوراً جھر جھری لی۔

''میں تو تباہ ہو جاؤں گا۔'' اُسکے منہ سے بیساختہ نکلا تو سب نے رک کر، حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تم تباہ ہو چکے ہو۔'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں تباہ ہو گیا ہے یہ؟'' عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔اصل میں یہ دوبارہ سے نشہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے ایسا مت کرو!'' حسین نے مصنوعی آنسو صاف کرتے کہا تو علی نے سنجیدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر عمر کو دیکھا۔

''ہم آفس کے ورکرز سے بات نہیں کر سکتے، پر ورکرز پورٹل پر یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں لوگ کتنا کام مکمل کر چکے ہیں۔'' علی نے اُسے کہا۔

''میں تو روز پورٹل دیکھ لیتا ہوں۔ کل ٹکٹس بھی چلائی ہیں میں نے کچھ ایمپلائیز کے نام پر۔ تا کہ وہ اپنا کام مکمل کر لیں۔'' عمر نے کہا۔

''مجھے بھی ذرا ٹکٹس دکھانا۔''

''اوپر کمرے میں آ جاؤ! مجھے پورٹل پر کچھ اور چیزیں بھی تمہیں دکھانی ہے۔'' عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا تو علی بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

''چلو! میں بھی جا رہا ہوں۔'' اُنکے جانے کے بعد حسین بھی جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' رضا نے پوچھا۔

''ایس ایس پی صاحب کا دماغ کھانے۔'' اُس نے مزے سے کہا۔

''سکون سے رہنے دو اُسے کسی وقت۔'' مقدّم نے کہا۔

''سوری! یہ تو نہیں ہو سکتا۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم آ رہے ہو ساتھ؟'' اُس نے رضا سے پوچھا۔

''نہیں! جب تک یہ ہال میں موجود ہے، تب تک تو بالکل نہیں!'' اُس نے ہال میں بیٹھے نوید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو حسین ہنسا، البتہ مقدّم نے کچھ نا سمجھی سے دیکھا۔

''چلو ٹھیک ہے پھر! میں اِسکو ہال سے گم کرتا ہوں۔'' وہ ہنستا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اُسکے جانے کے بعد مقدّم نے اپنی کرسی گھسیٹی اور رضا کے برابر کی جو سیگریٹ جلا چکا تھا۔

''تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اگر تم ناراض نہ ہو تو!'' اُس نے آہستہ اور سنجیدہ انداز میں رضا کو مخاطب کیا۔

''دوست سمجھتے ہو مجھے؟'' رضا کا سوال غیر متوقع تھا۔

''ہاں!'' اُس نے بلا توقف کے کہا۔

''تو پھر میری ناراضگی کی فکر نہ کرو، کیونکہ تم نے ہی تو کہا تھا کہ دوست ہو گا تو برا نہیں مانے گا۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرایا۔

''مجھے یونیورسٹی کے زمانے سے ہی ایک کنفیوژن تھی، سوچا تھا تم سے پوچھوں پر اُس وقت میں پوچھ نہیں سکا۔ وہ کنفیوژن آج بھی ہے۔'' اُس نے تمہید باندھی۔

''کیسی کنفیوژن؟''

''مجھے یونیورسٹی کے دور میں ایسا لگتا تھا جیسے۔۔۔'' وہ رکا۔ ''جیسے تم حورعین کو پسند کرتے تھے۔'' اُس نے وہ سوال پوچھ لیا جو وہ کب سے پوچھنا چاہتا تھا۔ رضا ہنسا، پھر سگریٹ کو منہ سے لگا کر دھواں ہوا میں چھوڑا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ رات کی رانی کی بڑھتی خوشبو میں سگریٹ کی بو ملنے لگی تھی، سرد ہوا کے جھونکوں نے ہاتھ پاؤں یخ کر دیئے تھے۔

''بس! مجھے تمہارے انداز سے ایسا لگتا تھا کبھی کبھی، اس لیے پوچھ لیا۔ پھر جب ہم نے حورعین کی منگنی کی خبر سنی تھی، اُس وقت بھی تمہارا ردعمل ایسا تھا جیسے تمہیں یہ خبر پسند نہ آئی ہو۔'' اِس بات پر وہ پیچھے ہو کر بیٹھا اور اسے دیکھا۔

''مقدّم! حورعین مجھے بھائی کہتی تھی۔ اور بھائی ہی سمجھتی تھی، اس زبانی رشتے کے ناطے میں اُسکی بہت عزت کرتا تھا۔ اور اُسکی منگنی پر میں پریشان اس لیے ہوا تھا، کیونکہ مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے وہ حسین کو پسند کرتی ہے، اس لیے ان دونوں کی منگنی پر مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ بس! اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ محرابی کھڑکیوں کے اُس پار ہال میں بیٹھا حسین حقیقتاً نوید کا جینا حرام کرتا نظر آ رہا تھا۔

''وہ تمہیں بھائی سمجھتی تھی۔ اور تم؟'' اُس نے پوچھا۔

''وہ ہمارے دوست کی بیوی ہے، اِس رشتے سے ہمیں اُسکی عزت کرنی چاہیے۔ اور ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے، جس سے حسین کے دل میں کوئی غلط خیال آئے۔ اس لیے تم دوبارہ ایسا کچھ مت سوچنا۔ ویسے بھی۔۔۔ جس دور کی تم بات کر رہے ہو، تب میرے پاس یہ

سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔اور نہ میں ایسے کوئی خواب سجاتا تھا۔ میں لاوارث تھا، آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بھلا میں کیسے کسی کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکتا تھا؟ یا ایسا سوچ بھی سکتا تھا؟''اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کی۔ مقدّم اُسے دیکھتا رہ گیا۔اُس نے سیدھے سیدھے لفظوں میں جواب نہیں دیا تھا۔

''خیر ! تمھیں اب تو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ تمہاری اپنی پہچان ہے، اپنا نام ہے۔ تمھیں کسی والی وارث کی ضرورت نہیں ہے۔اس لیے، تم بھی اب گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔'' مقدّم نے اسکو خود ترسی کی کیفیت سے نکالنا چاہا۔ رضا کے تصوّر میں سیاہ آنکھوں اور سانولی رنگت والا چہرہ لہرایا۔

''سوچیں گے ! پہلے یہاں سے نکل تو جائیں۔''اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اندر آجاؤ، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''اُس نے مقدّم کو کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رضا اندر چلا گیا۔ مقدّم کی نظروں نے دور تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔اُس نے سیدھے لفظوں میں اُسکی بات کا انکار نہیں کیا۔اُس نے اقرار بھی نہیں کیا تھا۔اُس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اور اُس نے یقیناًاُس دور میں بھی اپنے حالات کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی تھی،اور دل سے وہ تمام خواہشات نکال دی تھیں، جو اُسکے نصیب میں نہیں تھی۔

اُسکی نظروں سے دور ہوتا رضا اُسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔اُس پر فرض تھا کہ وہ اس بات کو ایسے بھلا دیتا جیسے ہوئی نہ ہو۔

سب کو سب کچھ نہیں ملتا۔۔۔

کچھ نہ ملنے میں بہتری ہوتی ہے۔۔۔

اور اس سے بہترین کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔۔۔۔

--------+---------+----------

مورخہ چھے جون

وہ دن جسکا سب کو انتظار تھا۔

کل پوری رات عجیب سی بے چینی رہی تھی۔بے شک اُنہیں اللہ کے بعد ایف آئی اے پر بھروسہ تھا۔پر مورخہ چھ وہ تاریخ تھی، جس روز یہ سب ہونا تھا۔اسی طرح بے چینی میں رات گزر گئی۔ صبح سویرے اُنہوں نے سامان باندھ لیا۔ناشتہ کر کے سب ہال میں موجود تھے۔پر آج ایک جامد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔نوید مستقل ٹہل رہا تھا،اُسکی نظریں بار بار موبائل پر جاتی تھیں۔ایک عجیب سی خاموشی تھی وہاں۔ جیسے طوفان آنے سے پہلے ہوتی ہے۔پھر اُنکا آج حویلی میں آخری دن بھی تھا۔

اُسی طرح کرتے شام ہو گئی۔دوپہر میں نوید کے پاس کوئی فون آیا تھا، جسے سننے کے لیے وہ جا کر کمرے میں جو بند ہوا تو اب شام ہونے کو آئی پر باہر نہ آیا۔اس وجہ سے کسی نے دوپہر میں کچھ کھایا بھی نہ تھا۔اُنکی سانسیں اُسکے فون کے ساتھ اٹک گئی تھیں جیسے۔بلآخر شام پانچ بجے نوید سیڑھیاں اُتر کے آتا دکھائی دیا۔

مورخہ چھے آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، کچھ وقت اور باقی تھا۔یہی وہ تاریخ تھی جس نے اُنہیں پچھلے چھے ماہ سے جوڑ رکھا تھا۔نوید نیچے آیا توسب نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہم لوگ اسکردو ایئرپورٹ کے لیے نکل رہے ہیں۔ایک پرائیویٹ جیٹ کے ذریعے ہمیں آج رات ہی کراچی پہنچنا ہے۔ فلائٹ چھے بجے کی ہے۔ ہم ابھی نکل رہے ہیں۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔البتہ انداز میں ایک تیزی سی تھی۔

''کیا کچھ ہوا ہے؟''عمر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرے گھر کے پاس، آج صبح فجر سے قبل کسی مشکوک انسان کو گرفتار کیا گیا ہے۔ فلحال مجھے نہیں بتایا گیا کہ وہ کون ہے۔اُسکے پکڑے جانے کے بعد پچھلے بارہ گھنٹوں سے تم سب کے گھروں کے آس پاس کڑی نگرانی کی گئی ہے، پر کوئی قابلِ ذکر گرفتاری نہیں ہوئی۔فرّخ صاحب کا کہنا ہے کہ گرفتار ملزم بہت اہم ہے۔ ہمیں فوری کراچی پہنچنا ہے۔''اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''ہمارے گھر والے ٹھیک ہیں؟''علی نے پوچھا۔

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔ابھی تم سب فرّخ صاحب کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچو گے۔گھر کوئی نہیں جائیگا،اور نہ ہی کوئی گھر والوں کو اطلاع دے گا۔''نوید نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چلو پھر! سامان لے کر باہر آؤ۔ ایک مرتبہ دیکھ بھی لینا کوئی چیز رہ نہ گئی ہو۔ اکرم ہمیں ایئرپورٹ تک پہنچادے گا۔'' وہ کہہ کر باہر نکلا۔

حویلی چھوڑنے پر ایک عجیب سی اُداسی وجود میں سرائیت کرنے لگی تھی۔ اس جگہ سے ایک انسیت سی ہوگئی تھی۔ یا شاید! یہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارا وقت تھا، جسکی اُنہیں ضرورت تھی۔ جاتے وقت نوید نے دونوں دروازے بند کرکے اس پر تالا لگایا، اور اکرم نے مین فیڈر گرادیا۔ حویلی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ ایک آخری نگاہ حویلی پر ڈالنے کے بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اکرم نے اُنہیں سکردو ایئرپورٹ چھوڑ دیا۔ نوید سارے راستے چوکنا بیٹھا رہا تھا۔ اُسکا ہاتھ ہمہ وقت بندوق پر ہی تھا۔ ایئرپورٹ پہنچتے ہی اُنہیں جیٹ میں سوار کردیا گیا۔ چھے بجے کی فلائٹ اپنے وقت پر پرواز بھرتی آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ بلندی سے سکردو کے برف میں لپٹے پہاڑ، اور اُنکی چوٹیوں پر پڑتی ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں، ایک الگ ہی اُداس سا الوداع کہہ رہی تھیں۔ اُنکے درمیان ویسے ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسی کسی بھی سفر سے واپسی کے دوران ہوتی ہے۔ بلآخر سوا آٹھ بجے اُنہوں نے کراچی کی زمین پر قدم رکھا۔ ایئرپورٹ پر انسانوں کا جم غفیر اُمڈ آیا تھا۔ ایئرپورٹ سے ہی اُنہیں ایف آئی اے حکام نے باحفاظت گاڑیوں میں بٹھایا تھا۔ جہاں سے اب وہ پھر کسی انجان منزل کی طرف جارہے تھے۔

ایک ماہ اور کچھ دن، خاموش پہاڑوں کے درمیان گزارنے کے بعد شہر کی رونقیں جہاں بھلی لگ رہی تھیں، وہیں شور شرابہ گراں بھی گزر رہا تھا۔ گاڑی آٹھ پینتالیس کے قریب ایک مضافاتی علاقے میں بنے گھر کے پاس رکی۔ آس پاس بہت سے خالی پلاٹ تھے، لگ رہا تھا جیسے یہ علاقہ ابھی آباد نہیں ہوا ہے۔ بہت دور دور گھر بنے نظر آرہے تھے۔ وہ لوگ گاڑی سے اترے۔

''فرّخ صاحب نے تم سب کو فلحال یہاں رہنے کا کہا ہے۔ گھر محفوظ ہے، اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس ملزم سے تفتیش جاری ہے، میں بھی وہیں جارہا ہوں۔'' نوید نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اطلاع دی۔ پر باہر نہیں آیا۔

''اور ہم یہاں کیا کریں گے؟'' رضا نے پوچھا۔

''تم لوگ اندر اپنا سامان رکھو، اور فریش ہو جاؤ۔ کچھ دیر میں فرّخ صاحب تم سب کو میٹنگ (مشاورت) کے لیے آفس بلوائیں گے۔'' اُس نے کہا۔

''میں چلتا ہوں۔'' پھر اپنی طرف کا دروازہ بند کرکے شیشہ اوپر کرلیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

گھر جدید طرز پر بنا ہوا تھا۔اندر آکر بھی خاموشی چھائی رہی۔سامان رکھ کر وہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔گھر میں ایک آدھ ملازمین بھی موجود تھے۔اُنکے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے آئے۔اسی طرح مزید ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔

''ہم کب تک کرائے داروں کی طرح گھر ہی تبدیل کرتے رہیں گے۔''حسین نے ازراہِ مذاق کہا۔

''میں اب تنگ آچکا ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں بس!''علی بھی بیزار ہوا۔

''ہم سب یہی چاہتے ہیں۔''عمر نے کہا۔

''پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔''اُس نے بیزار کن لہجے میں کہتے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''پریشان نہ ہو، کوئی ملزم پکڑا گیا ہے،امید ہے کہ اِس بار سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔''عمر نے کہا۔

''ایسے مجرم پہلے بھی پکڑے گئے ہیں۔مائیکل اور خلیل ہمارے سامنے ہیں۔پر کچھ نہیں ہوا۔'' پتہ نہیں اُسے کیا ہوا تھا؟ کیوں اتنا بیزار ہو رہا تھا؟ یا شاید سفر کے اختتام پر وہ فطری طور پر اپنے گھر میں موجود ہونا چاہتا تھا۔اب اِس جگہ آنا اُسے برا لگ رہا تھا۔

''وہ دونوں مردہ تھے، پر ابھی ملزم زندہ پکڑا گیا ہے۔''مقدّم نے کہا۔

''معلوم نہیں! مجھے زہر لگ رہا ہے یہاں رہنا اب۔''اُس نے صاف گوئی سے کہا۔

''اتنا ہر بات کو دل سے نہ لگایا کرو۔ہر برا وقت گزر ہی جانا ہوتا ہے۔''حسین نے تسلی دیتے لہجے میں کہا۔

''تمہیں کیا پتہ برا وقت کیا ہوتا ہے؟''علی نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔اُسے فوراً ہی احساس ہوا کہ اس نے غلط کہا ہے۔ابھی اُسے خود کو بدلنے کے لیے کچھ اور وقت چاہیے تھا، پینتیس سال کی عادت تھی، پینتیس دنوں میں نہیں جاسکتی تھی۔

''میرا مطلب۔۔۔''وہ کوئی وضاحت دینے ہی لگا۔

''تم لوگوں کو مظلوم بننے کی عادت ہو چکی ہے۔''حسین نے اُسکی بات کاٹتے ہوئے کہا تو سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔نوید بنگلے کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا، چہرے پر سختی، نفرت، غصّہ۔۔۔اور سب کچھ تھا۔

''تم لوگوں کو لگتا ہے دنیا کے سارے غم تمہیں ہی ملے ہیں۔ حالانکہ ہوا تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہے۔ پر وہی نا! مظلوم بننے کی عادت جو ہو گئی ہے۔''اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ لیونگ روم میں داخل ہوتا نوید دروازے پر ہی ٹھٹک کر رکا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''یہ بات مقدم کو بھی برا لگا تھا۔

''میرے دو بچے ہیں۔اِس سے قبل تین اور بھی تھے۔ دو جڑواں اور ایک اُنکے بعد۔''اس نے بڑے آرام سے بتایا تھا۔لفظ **تھا** پر سب کو سانپ سونگھا۔

''دو جو جڑواں تھے، اُن میں سے ایک کے دل میں سوراخ تھا، اور ایک کا لیور (جگر) مکمل بنا نہیں تھا۔ایک کا انتقال پیدائش کے ساتویں دن ہوا تھا اور دوسرے کا دو ماہ بعد۔ تیسرا جو دونوں سے دو سال چھوٹا تھا، وہ میری بیٹی تھی۔اسے ڈاؤن سنڈروم تھا۔اُسکا بھی چھے ماہ کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔''مرکزی دروازے پر لاک پر ہاتھ رکھے کھڑے نوید کا وہی ہاتھ لمحوں کے لیے کانپا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، اور سب دم سادھے سن رہے تھے۔''اُسکا جس روز انتقال ہوا، میں گردے کے انفیکشن میں مبتلا تھا۔ علاج کروانے کے بجائے پہلے اُسکے لیکر ہسپتال بھاگتا رہا، پھر انتقال ہوا تو میت و تدفین میں لگ گیا۔ طبیعت حد سے زیادہ بگڑی تو ڈاکٹر کے پاس گیا، تب معلوم ہوا لاپرواہی کی وجہ سے ایک گردہ فیل ہو چکا ہے۔ سرجری ہوئی، اور گردہ ریمو کر دیا گیا۔ ٹھیک ہونے کے لیے وقت درکار تھا، صحت یاب ہونے سے قبل ہی معلوم ہوا کہ آفس والوں نے نوکری سے نکال دیا ہے۔ میرا بھی دل کیا تھا کہ مظلوم بن جاؤ، روؤں پیٹوں کہ دنیا کے سارے غم تو مجھے ہی مل گئے ہیں، مایوس ہو جاؤں اور غم دل سے لگا کر بیٹھ جاؤں۔ پر میرے ماموں۔۔۔۔انہوں نے مجھے ایک جملہ کہا اور اُس دن میری ساری عقل ٹھکانے آ گئی۔''حسین جب سنجیدگی سے بات کرتا تھا تو آس پاس ہوائیں بھی جیسے تھم جاتی تھیں۔ وہ بہت گہرا تھا۔۔۔۔بہت گہرا!

''انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں حضرت ایوب علیہ السلام سے زیادہ غم ملے ہیں؟ کیا تمہارے اوپر آزمائشیں حضرت محمد ﷺ سے زیادہ آ گئی ہیں؟''اِس سوال پر جو جہاں تھا وہاں سے ہل بھی نہ سکا۔ وہ غمزدہ نہیں تھا، نہ وہ اپنے غم کسی ہمدردی کے لیے بتا رہا تھا۔ وہ سمجھانا چاہتا تھا، وہ بات جو انہیں کوئی نہ سمجھا سکا۔

''ہمارے نبی ﷺ کی ایک بیٹی کے علاوہ اُنکی تمام اولادیں اُنکی زندگی میں انتقال کر گئیں، بچپن میں بھی، لڑکپن میں بھی اور جوانی میں بھی۔ **(نوید کا سر جھکا)**۔ اُنکی سب سے عزیز زوجہ اُس وقت انتقال فرما گئیں، جس وقت انہیں، اُنکی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ **(مقدّم**

شر مسار ہوا)۔ وہ یتیم پیدا ہوئے تھے، اُنکی ماں اُنہیں چھے سال کی عمر میں چھوڑ گئی تھیں، جس وقت ایک بچے کو سب سے زیادہ اپنی ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ **(رضا کی آنکھوں میں نمی آئی)**۔ اُنکے خاندان والوں نے اُن سے منہ موڑ لیا، **(عمر کا چہرہ بھی جھک گیا)**۔ اُنہیں اُنکے اپنے قبیلے والوں نے بے گھر کر دیا۔ اُنکو ہر اُس شخص نے اکیلا کر دیا، جو کبھی اُنکی سب سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ **(علی کو لگا جیسے اب وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے گا)**۔ یہ سارے غم فقط ایک ہی ہستی نے اکیلے سہے تھے۔ پر وہ تو نہ دنیا چھوڑ کر بیٹھے، نہ انہوں نے مسکرانا چھوڑا، نہ اپنے مقصد سے پیچھے ہٹے، نہ اپنے غموں کا بدلہ دنیا والوں سے لیا، نہ کسی کا حق مارا اور نہ ہی کسی کا دل اپنی زبان سے توڑا۔ تو پھر مجھ پر کونسا ایسی آفت آگئی ہے، جو میں دنیا سے منہ موڑ لوں؟ جب یہ دنیا فانی ہے تو یہاں کے غموں کو کیوں سر پر سوار کرنا؟ جو چیز اللہ نے ہی دی تھی، اگر اُس نے واپس لے لی تو اِس میں میرا کیا نقصان؟ وہ تو اسی کی شے تھی۔ اور جو ہم سے چھین جاتا ہے، وہ آخرت میں ضرور واپس ملے گا۔ تو عارضی جدائی پر زندگی سے منہ کیوں موڑنا؟'' حسین نے بات مکمل کر لی تھی۔ وہ زندگی کے کسی بھی مقام پر پہنچ جاتے پر حسین جیسی سمجھ بوجھ کے لیے انہیں شاید ایسی دس اور زندگیاں چاہیے تھیں۔ اُس نے اُنکی سوچ کا ایک نیا در وا کر دیا تھا۔

وہ اِسی لیے کبھی دل میں بغض نہیں رکھتا تھا، اسی لیے وہ ناراضگی ختم کرنے میں ہمیشہ پہل کرتا تھا، کیونکہ اُس نے صحیح معنوں میں اِس دنیا کے غموں کو بیکار ہی سمجھا تھا۔ وہاں ایسی جامد خاموشی چھائی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ اُس نے اُنہیں اپنا محاسبہ کرنے کی دعوت دے دی تھی۔ بلآخر نوید گہری سانس لیکر اندر آیا تو سب کی نظریں اُس پر گئیں۔ اُسکے انداز میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی، جسے فلوقت وہ کوئی نام نہیں دے پا رہے تھے۔ چہرہ ستا ہوا، حد سے زیادہ سخت تھا۔ لب بھینچے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔

''ہمیں فوری چلنا ہے۔ ایک عورت پکڑی گئی ہے۔ اُس سے کچھ تفتیش بھی ہوئی ہے، تم لوگوں کو بھی اہم اطلاعات دینی ہیں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ آواز بیٹھی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ بہت چیخا ہو۔

''سب ٹھیک ہے نوید؟'' علی نے تشویش سے اُسے دیکھا۔

''باہر آجاؤ جلدی! میں انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا تھا؟

وہ لوگ بھی اُٹھ کر اُسکے پیچھے چل دیئے۔

----------+---------+--------

''صبح کی نیلی روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔رنگارنگ پھلوں سے سجا باغ صبح کی روشنی میں جنت لگ رہا تھا۔ٹھنڈی ہوائیں،اور سامنے بہتے دریامیں گرتی بارش کی بوندیں۔۔۔۔منظر تھا کہ دل میں اترتا جارہا تھا۔وہ وہیں گھاس پر ایک درخت سے ٹیک لگائے پرسکون بیٹھی تھی۔دریااُسکے سامنے تھا۔بوندوں کی ٹپ ٹپ آواز بڑی بھلی معلوم ہورہی تھی۔

مما!مما!''وہ اپنے ننھے ننھے قدموں سے اُسکے پاس آیاتو وہ مسکرائی۔

''میرے دل کے ٹکڑے!''اُس نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھالیا۔

''مما!''وہ اُسے چھوٹا سا پھول دینے لگا۔اُس نے ہنستے ہوئے تھام لیا۔

وہ ہنس رہی تھی،بہت زور سے۔۔۔۔

اور اسی لمحے اُسکی آنکھیں کھلی۔چہرے پر مسکراہٹ ابھی بھی تھی۔اُس نے آنکھیں مل کر دوبارہ کھولیں تو منظر تبدیل ہو چکا تھا۔وہ اپنے کمرے میں تھی۔اور اُسکا بیٹا؟

''میرا بیٹا!''بشریٰ ہڑبڑا کر اٹھی۔رات کے دو بج رہے تھے۔اُسکا بیٹا کہیں نہ تھا۔اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔وہ خواب تھا۔

''تم کہاں ہو نوید؟''اُس نے دل میں نوید کو پکارا تھا۔

----------+---------+--------

ڈیڑھ گھنٹے پہلے:

(ایف آئی اے آفس میں)

''السلام علیکم!''نوید اندر داخل ہوا تھا۔سامنے ہی فرّخ صاحب،فیصل اور شیراز موجود تھے۔

''وعلیکم السلام!''انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کون ہے وہ ملزم؟''اُس نے فوراًپوچھا۔

''اسے ٹیم نے پکڑا تھا۔اس نے اپنا نام شاہانہ بتایا تھا۔اسے ہم تمہارے گھر کے آس پاس بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے۔اُسکی مشکوک سرگرمیوں کی بناپر اسے گرفتار کیا گیا ہے۔اُسکے پاس اسلحہ بھی موجود تھا،اُسکے موبائل کا ڈیٹا بھی نکلوایا گیا ہے،اس نے مختلف نمبروں سے مائیکل سے رابطہ کیا ہوا ہے۔اُسکی کال آڈیو کو ریکور کیا جارہا ہے۔لیکن۔۔'' وہ رکے۔

''لیکن؟''

''اُسکا نام شاہانہ نہیں ہے۔وہ جب یہاں آئی تب ہمیں معلوم ہوا۔''شیراز نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ اپنا اصلی نام کیوں بتائے گی؟''نوید نے کندھے اچکائے۔ اُسکے نزدیک یہ عام بات تھی۔باقی تینوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔نوید کو اُنکے انداز میں کچھ عجیب لگا۔

''کیا ہوا ہے؟''اُس نے ناسمجھی سے اُنہیں دیکھا۔

''تم میرے ساتھ تفتیشی کمرے میں آؤ!''فرّخ صاحب کھڑے ہوئے۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔اسی لمحے شیراز کا فون بج اٹھا۔اُس نے کال اٹینڈ کر کے فون کان سے لگایا۔اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا دوسری جانب کی آواز سن کر وہ بوکھلایا۔

''کیا ہوا ہے؟مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟'' وہ تقریباً چیخا تھا۔کمرے سے باہر کی طرف بڑھتے نوید اور فرّخ صاحب یکدم ہی رکے۔

''کیا ہوا شیراز؟''فیصل نے پوچھا تھا۔اُسکے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔

''میں آتا ہوں۔''اُس نے تیزی سے فون جیب میں رکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''سر!مجھے فوراً گھر جانا ہے۔''اُس نے فرّخ صاحب کے پاس آتے ہوئے کہا۔اُسکے چہرے پر کچھ تھا۔

''ٹھیک ہے!تم جاؤ۔''اُنہوں نے کچھ بھی پوچھے بنا اُسے فوراً اجازت دی تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''تم آؤ!''فرّخ صاحب نوید کو کہتے آگے بڑھ گئے۔اُنکے انداز میں کچھ خاموشی سی تھی۔وہ بھی چپ چاپ سا اُنکے پیچھے چلنے لگا۔ذہن شیراز کی طرف بھی تھا۔نجانے اسے اچانک کیا ہوا تھا؟فرّخ صاحب نے پوچھا تک نہیں اُس سے۔

بلآخر وہ تفتیشی کمرے میں پہنچے اور دروازہ کھولا۔ نیم اندھیرے تفتیشی کمرے کے درمیان میں ایک میز تھی، جسکے اوپر ایک بلب روشن تھا۔ دونوں جانب کرسیاں تھیں۔ ایک خالی تھی اور ایک پر وہ طرح دار قسم کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نیم اندھیرے میں اُسکا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ نوید آگے بڑھا اور دروازہ بند کر دیا۔ فرّخ صاحب اُسکے آگے تھے۔ جیسے ہی وہ سامنے سے ہٹے، سامنے بیٹھی عورت نے مسکراتے ہوئے چہرہ اٹھایا اور براہ راست اُسے دیکھا۔

اور نوید کے پیروں تلے زمین کھسکی۔۔۔

اسے قطعاً امید نہ تھی کہ وہ اس عورت سے سامنا کرنے والا ہے۔

''فرح؟'' اُس کے لب بے یقینی سے ہلے۔ اُسکی مُسکراہٹ گہری ہوئی۔ نوید تو پتھر کا بت بنے اُس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جو اُسکے بچوں کی قاتلہ تھی۔ جس نے اُسکی زندگی تباہ کی تھی، اُسکی پوری کائنات اُجاڑی تھی۔

''تم؟'' بے یقینی سے یقین تک کا سفر طے کرتے ہی اُسکے لب بھینچے۔

''کیسے ہو ایس ایس پی نوید عالم؟'' وہ مسکرائی۔ اگلے ہی لمحے نوید کا ہاتھ اپنی کمر میں رکھی بندوق پر گیا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔'' اُس نے گن اس پر تانی ہی تھی کہ ڈی آئی جی صاحب نے اُسکا ہاتھ نیچے کیا۔

''نوید!'' انہوں نے تنبیہہ انداز میں اُسے دیکھا۔ وہ جذباتی نہیں ہوتا تھا، پر آج ہو رہا تھا۔

''کیا نوید؟'' وہ حلق کے بل چیخا تو اُنہوں نے حیران نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''یہ میرے بچوں کی قاتل ہے۔ میں نے بہت صبر کیا ہے، پر آج نہیں! قصاص مجھ پر واجب ہے۔'' اُس کے جسم کا سارا خون اِس لمحے اُسکے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

''نوید! ہوش میں آؤ۔ یہ عورت ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہی ہمیں اصل قاتل تک لیکر جائے گی۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''بھاڑ میں گیا وہ قاتل۔ یہ ہمیشہ میرے سامنے سے چلی جاتی ہے۔ میرے بچوں کو زندہ جلا کر یہ آزاد گھوم رہی ہے۔ میں نہیں چھوڑ سکتا اِسے۔'' اُسکا گلا رندھ گیا۔ اِس بات پر وہ طنزیہ ہنسی۔

''بس کرو نوید! یہ عورت بہت سے لوگوں کی مجرم ہے۔ تم اسے مار کر اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کے ساتھ زیادتی کرو گے۔ یہ منہ کھولے گی، ہر حال میں کھولے گی۔'' انہوں نے فرح کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جواب بھی بڑی دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُسکا پر سکون انداز نوید کے اندر آگ لگا رہا تھا۔ وہ اتنی پر سکون کیوں تھی؟

''اس کی تمام کال ریکارڈ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ یہ اس گروہ کے سرغنہ کی بہت قریبی ساتھی ہے۔ اور یہی اُسکے لیے پاکستان میں کاروبار چلاتی ہے، یہاں کے لوگوں سے اُسکی تمام ڈیلنگ بھی اِس عورت کے ہی ذمّے ہے۔ مزید معلومات یہ ہمیں خود دے گی۔ کیونکہ اپنے لوگوں سے یہ کال کے دوران بھی کوڈ ورڈز میں بات کرتی رہی ہے۔'' ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

''واہ واہ! کتنے ذہین لوگ ہو تم سب۔'' فرح نے مذاق اڑایا تھا۔ وہ کوئی پاگل ہی تھی۔

''میرا ضبط مت آزماؤ، ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم ایک عورت ہو۔'' نوید نے سرخ ہوتی آنکھوں سے کہا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے اسے پیچھے کیا اور خود فرح کے سامنے آئے، پھر دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹکائے، ذرا جھک کر اُسے سرد نگاہوں سے دیکھا۔

''تم ایک ایک لفظ بتاؤ گی۔ اِس ملک میں موجود جن جن لوگوں سے تم نے رابطہ کیا ہے، وہ سب صبح تک یہاں ہوں گے۔ تم سب کا انجام تمہاری سوچ سے بھی بھیانک ہوگا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ انسانیت سوز سلوک نہ کیا جائے، تو تم وہ سب بتاؤ گی جو ہم تم سے پوچھیں گے۔'' انکا لہجہ لہو جماتا ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہنسی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟'' اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے معصومیت سے اُنہیں دیکھا۔

''بس!'' نوید نے آگے بڑھ کر چیختے ہوئے میز پر ہاتھ مارا تھا۔ اُسکا ضبط جواب دے رہا تھا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو وہ اب تک اُسکی کھال اُدھیڑ چکا ہوتا۔ صرف اُسکے عورت ہونے کا لحاظ کر رہا تھا۔

''تمہارے ساتھ اِس سے زیادہ لحاظ نہیں رکھا جائیگا، یہ جان لو۔'' نوید نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے چبا چبا کر کہا۔ پر اُسکے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اگر مجھے کچھ بھی ہوا، تو تم اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکو گے۔''اُس نے کہا، تو نوید اور ڈی آئی جی صاحب نے نا سمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اگر تم نے مزید ہمارا وقت ضائع کیا تو۔۔۔''

''تمہارا بیٹا میرے پاس ہے نوید عالم!'' وہ نوید کی بات کاٹتی ہوئی چیخی۔ اگلے ہی لمحے نوید نے وحشت ناک انداز میں اُسکو بالوں سے جکڑا اور اسکا چہرہ اوپر کیا۔ اس بار ڈی آئی جی صاحب نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلکہ حیران آنکھوں سے اُسے دیکھتے رہے۔

''اپنی بکواس بند کرو!'' وہ اُسکے منہ پر دھاڑا۔ ''میرے بیٹے مر چکے ہیں۔ تم نے مارا ہے اُنہیں۔''نوید نے جھٹکے کے ساتھ اُسکے بال چھوڑے۔ اُس نے دوبارہ چہرہ اُس کی جانب موڑا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں بیوقوف تھی؟ میں بہت اچھے سے جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن تم مجھے ڈھونڈ کر میری جان لے لو گے۔ ایسے دن کے لیے۔۔۔ ایسے ہی دن کے لیے میں نے تمہارے بیٹے کو زندہ رکھا۔ تمہارا چار ماہ کا چھوٹا بیٹا، جسکی لاش کے نام پر تم نے فقط ہڈیوں کو دفنایا تھا۔ وہ زندہ ہے۔۔۔ وہ زندہ ہے نوید عالم! اور میرے پاس ہے۔ وہ ہڈیاں اُسکی نہیں تھیں۔۔۔ وہ کسی اور کی تھیں، اُسے میں زندہ وہاں سے لے گئی تھیں۔ اور تم اسے مردہ سمجھتے رہے۔ اُسے میں نے اسی دن کے لیے پالا ہے۔'' وہ سفاکی سے ہنستی، کہتی ذہنی مریضہ لگ رہی تھی۔

''جھوٹ۔۔۔ جھوٹ بول رہی ہو تم۔''نوید نے بے یقینی سے کہا۔

''تم جھوٹ سمجھتے رہو، اور وہاں تمہارا بیٹا، جو تب نہیں مرا تھا۔ وہ اب مارا جائیگا۔ بہت بے دردی سے۔۔۔۔''

''جھوٹ بول رہی ہو تم۔''اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نوید نے زوردار تھپڑ اُسکے منہ پر دے مارا تھا۔ قاتل نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت۔۔۔ وہ صرف قاتل ہوتا ہے۔ کسی کی سزا صرف اُسکے جنس کی بنا پر کم نہیں کی جاسکتی۔

''اگر مجھے کچھ بھی ہوا نوید عالم! تو تم اپنے بیٹے کو ٹکڑوں میں پاؤ گے۔'' وہ چلائی۔

''تم۔۔۔''

''رکو نوید!''ڈی آئی جی صاحب نے کہا، پھر فرح کی جانب دیکھا۔

''کیا ثبوت ہے اس بات کا؟''انہوں نے سخت نظروں سے اُسے دیکھتے پوچھا۔

''میرے بیگ میں اسکے بیٹے کے بال اور ناخن موجود ہیں۔ جاؤ اور جا کر انکا ڈی این اے کروالو۔ تمہیں یقین آجائیگا کہ وہ میرے پاس ہی ہے۔''اُس نے کہا تو انہوں نے فوراً فیصل کو انٹر کام کیا۔

''میں نہیں مانتا۔۔۔ یہ کوئی چال چل رہی ہے۔''نوید کا دل کیا کہ اپنے بال نوچ لے۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور کچھ خواتین عملہ اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم! میں ایس ایس پی ثناء ہوں۔ یہ دونوں میری ماتحت اے ایس پیز ہیں۔''آنے والی نے اپنا تعارف دیا۔

''یہ عورت اب آپ کے حوالے ہے ثناء۔ اس سے تمام حقیقت اُگلوانا آپ کے ذمّے ہے۔ یاد رہے، اسے مرنا نہیں چاہیے۔''ڈی آئی جی صاحب نے اسے کہا۔

''تم میرے ساتھ آؤ نوید!''انہوں نے نوید کو کہا۔

''یاد رکھنا، جتنی خراشیں مجھے آئیں گی۔ تمہیں اتنی ہی خراشوں کے ساتھ اپنا بیٹا واپس ملے گا۔ کیونکہ مجھے زندہ چھوڑے بنا تم اپنا بیٹا نہیں لے سکتے۔''وہ چلائی تھی۔

''خاموش!''ثناء نے زوردار قسم کا تھپڑ اُسکے گال پر جڑ دیا۔ ڈی آئی جی صاحب نوید کو لیے اپنے کمرے میں آگئے، فیصل وہاں پہلے سے موجود تھا۔

''نوید! تمہیں صبر رکھنا ہوگا۔''انہوں نے اُسے بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر کہا۔

''کیسے صبر کروں میں؟ اور کتنا؟ وہ عورت جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہے۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں صبر کروں۔ کیسے یقین کر سکتے ہیں آپ اُسکی بات پر؟''وہ ایک بار پھر حلق کے بل چیخا تھا۔

''ہوش کے ناخن لو نوید! اسکے بیگ سے واقعی ناخن اور بالوں کا ایک پیکٹ ملا ہے۔ یہ ناخن تین سے چار سال کی عمر کے بچے کے ہی لگتے ہیں۔ ہم اسے فوری طور پر ڈی این اے کے لیے بھیج رہے ہیں۔''

''آپ اُسکی بات پر یقین کر رہے ہیں؟'' اُس نے بے یقینی سے کہا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ کوئی کھیل کھیل رہی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے اُسے بازوؤں سے تھاما۔

''اگر وہ سچ کہہ رہی ہو تو؟ کیا تم اپنے بیٹے کو مرنے چھوڑ دو گے؟'' اُنکے سوال پر وہ سناٹوں میں رہ گیا۔

''اسی لیے، مجھے میرا کام کرنے دو۔ اب تم جاؤ اور اپنے دوستوں کو باحفاظت یہاں لے کر آؤ۔'' انہوں نے اپنی کرسی کے پاس جاتے ہوئے کہا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ آپ کسی اور کو بھیج دیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ڈیٹس مائی آرڈر (یہ میرا حکم ہے)!'' انہوں نے سختی سے کہا تو وہ لب بھینچتا اُٹھ گیا۔

''تم اسے فوراً ڈی این اے کے لیے دو۔'' اُسکے جانے بعد انہوں نے فیصل سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے!'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''فیصل!'' انہوں نے پکارا تو وہ رکا۔

''شیراز سے کوئی بات ہوئی؟'' اُنہیں اُسکی فکر بھی تھی۔

''ابھی تک تو نہیں!'' اُس نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''ٹھیک ہے! جیسے ہی کوئی بات ہو تو مجھے بتانا۔'' انہوں نے کہا۔

----------+---------+--------

وہ اُنہیں لے کر ایف آئی اے کی بلڈنگ میں داخل ہوا۔اُسکے چہرے پر خطرناک حد تک سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔کسی نے بھی دوبارہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

صرف وہ ہی نہیں، بلکہ ایف آئی اے کے آفس میں بھی ایک نامعلوم سی خاموشی چھائی تھی۔مشاورتی کمرے تک پہنچتے پہنچتے یہ خاموشی بڑھ چکی تھی۔فیصل اور ڈی آئی جی صاحب بالکل ساکت وجامد سے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ لوگ بھی خاموشی سے اپنی نشستیں سنبھالنے لگے۔نوید بھی بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کی آواز گونجی۔

''رکو نوید!''کرسی گھسیٹتے نوید نے رک کر دیکھا۔

''تم فوری طور پر ہسپتال جا رہے ہو۔''اس حکم پر اُس کی تیوری پر بل پڑے۔

''اب کیا ہو گیا ہے؟''وہ جھنجھلایا۔

''کچھ لوگوں نے گھر میں گھس کر، شیراز کی بیوی کے گلے پر چاقو پھیر کر اُسے قتل کر دیا ہے۔''انہوں نے آہستہ لہجے میں کہا۔کرسی کی پشت پر رکھا نوید کا ہاتھ کانپا تھا۔

''ہاں؟''اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''تم فوراً ہسپتال جاؤ۔''

''کس نے کیا یہ؟''اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھا تھا۔

''تمہیں اِس لیے وہاں بھیج رہا ہوں۔جائے وقوعہ پر ٹیم موجود ہے، تم ہسپتال جاؤ اور عینی شاہدین سے معلومات لو۔اپنے ساتھ فیصل اور باقی ٹیم کو بھی لے جاؤ۔''انہوں نے کہا۔

''اُسکی بیوی قتل ہو گئی ہے اور آپ کو تفتیش کی پڑی ہے۔''وہ تاسف سے کہتا باہر نکل گیا۔ڈی آئی جی صاحب نے لب بھینچے، وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔انہوں نے فیصل کو سر کے اشارے سے اُسکے پیچھے جانے کو کہا تو وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔

انہوں نے گہری سانس بھر کر ماتھا مسلا، پھر سنجیدگی سے اُن سب کو دیکھا جو خاموش بیٹھے تھے۔

''کیسے ہو تم سب؟ ہم نے ایک خاتون کو پکڑا ہے۔ فلحال، اس سے تفتیش جاری ہے اور۔۔'' وہ ہر بات بتاتے چلے گئے۔ ہر دن پہلے سے زیادہ بے یقینی لاتا تھا۔ ہر روز ایک نیا انکشاف انکا منتظر ہوتا تھا۔

''اُس نے جن لوگوں سے رابطہ کیا ہے، مجھے امید ہے کہ صبح تک وہ سب کے سب پکڑے جائیں گے۔ پھر تم لوگ گھر جا سکتے ہو، لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ ہم ہر وقت تمہاری حفاظت کریں گے۔ فلحال! آج رات تم سب کو اسی گھر میں رہنا ہو گا۔'' انہوں نے بات مکمل کی۔

''کیا نوید کا بیٹا واقعی زندہ ہو گا؟'' علی نے پوچھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن اگر وہ سچ بول رہی ہوئی، تو تم لوگ بتاؤ، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا اُسکے بدلے نوید کے بیٹے کو واپس لانا چاہیے یا اُسے کسی بھی حال میں یہاں سے جانے نہیں دینا چاہیے؟'' انہوں نے جانچتی نظروں سے سب کو دیکھا تھا۔

''آپ کو نوید کے بیٹے کو حاصل کرنا چاہیے۔'' حسین نے سب کی جانب سے جواب دیا تھا۔ باقی سب نے بھی سر ہلا کر تائید کی تھی۔

''اور اتنی ماؤں کے بچے، جو اس نے اسمگل کر کے کسی اور ملک بیچ دیئے، یا جنہیں مار دیا، کیا اُن سب کو بھول جانا چاہیے؟'' انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا، تو جواباً سب خاموش رہے۔

''پریشان نہ ہو، میں نہ نوید کے بیٹے کو اور نہ ہی اُس جرائم پیشہ گینگ کے سرغنہ کو ہاتھ سے جانے دوں گا۔'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا تھا۔

----------+---------+--------

ہسپتال کی راہداری خاموش تھی۔ اسٹیل کی کرسیوں میں سے ایک پر شیراز سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُسکا لباس خون آلود ہو رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں۔۔۔ آنکھیں پتھر ہو چکی تھیں۔

نوید کے برابر فیصل، اور اُن دونوں کے پیچھے مزید دو اہلکار راہداری میں داخل ہوئے، تب بھی اُسکے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ راہداری میں اُس سے تقریباً دس بارہ قدم کے فاصلے پر نوید رک گیا۔ شیراز کے سامنے اسٹریچر تھا، جس پر موجود وجود کو سفید چادر سے مکمل ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سفید چادر اُس وجود کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔ نوید کا دل ڈوبا۔ قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے۔

''فیصل!'' خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے برابر کھڑے فیصل کو آہستہ سے پکارا۔

''جی سر!''

''تم جاؤ اِسکے پاس۔'' اُس نے کہا تو فیصل گہرا سانس لیتا شیراز کی جانب بڑھا۔ معلوم ہوتا تھا اسکے لیے بھی یہ مرحلہ مشکل ہے۔ نوید جانتا تھا کہ اگر وہ خود گیا تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائے گا۔ اسے تسلی دینی نہیں آتی تھی۔ اور وہ آج بھی نہ آئی تھی۔

فیصل آہستہ سے چلتا اُسکے پاس گیا۔ اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پر شیراز کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر وہ اُسکے قدموں میں بیٹھا۔

''شیراز!'' اُس نے آہستہ سے اُسے مخاطب کیا تو شیراز نے آنکھیں اٹھا کر جن نظروں سے اُسے دیکھا تھا، فیصل تو فیصل، اُسکے پیچھے کھڑا نوید بھی اندر تک ہل گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اُس نے شیراز کا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔ یہ کیسا سوال تھا؟ بھلا وہ کیسے ٹھیک ہو سکتا تھا؟ اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر وہاں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر فیصل کھڑا ہوا تو وہ بھی رکا۔

''نمرہ قائم خانی۔۔۔ کیا ہوا ہے انہیں؟'' فیصل نے پوچھا۔ نوید کے پیچھے کھڑے باقی دونوں اہلکار بھی آگے بڑھنے لگے پر اُس نے اشارے سے دونوں کو روک دیا۔

''نمرہ قائم خانی ہمارے پاس زخمی حالت میں لائی گئی تھیں۔ اُنہیں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر اُنکے گلے پر چھری پھیر دی گئی تھی۔'' ڈاکٹر نے بتایا تھا یا کان میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا۔ نوید نے سختی سے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں تو اُن میں لہو اتر آیا تھا۔ وہ تیزی سے فیصل کے برابر آیا۔

''کس نے کیا ہے یہ سب؟''وہ ڈاکٹر کے سامنے دھاڑا تھا،اُسکا بس نہیں چل رہا تھا ساری دنیا اُلٹ دے۔یہ تو اسکی حالت تھی، نجانے شیراز کا کیا حال تھا؟ وہ تو ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی نمک کا مجسمہ ہو۔

''سمیر!''شیراز کی آواز پر سب نے مڑ کر اُسے دیکھا تھا۔اُسکا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔اگلے ہی لمحے نوید نے وہ کیا، جو اُس نے کسی کے لیے نہیں کیا تھا۔کسی کے لیے بھی نہیں!

وہ اُسکے قدموں میں بیٹھا، ایک ہاتھ اُسکے کندھے پر رکھا کر دوسرے سے اُسکا ہاتھ تھاما۔

''کیا ایس ایچ او سمیر؟''اُس نے پوچھا تھا۔آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

''ہاں! نمرہ نے اپنی آخری سانسیں میرے سامنے ہی لی تھیں۔اُس نے اُسی کا نام لیا تھا۔اس نے۔۔۔''

''بس۔۔۔ٹھیک ہے!''نوید نے اُسکا ہاتھ دبایا۔شیراز کا تنفس تیز ہونے لگا۔

''میں سمجھ گیا ہوں سب کچھ، تمھیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُس نے اُسکا کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔ایس ایچ او سمیر ہی تھا، جس نے پہلے بھی اُسکے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا۔کاش! اُس روز نوید نے اُسکی آنکھیں پھاڑنے کے بجائے اسے زمین میں گاڑ دیا ہوتا۔وہ کھڑا ہوا۔

''ایک اے ایس پی کے گھر میں اتنا سب کچھ ہو گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی؟ کیا کر رہے تھے سیکیورٹی پر مامور اہلکار؟''اُس نے فیصل سے پوچھا۔نمرہ کی سیکیورٹی کے پیش نظر پچھلے کئی دنوں سے اُسکے گھر کی سیکیورٹی بڑھا دی گئی تھی۔

''وہ اپنے باپ کے گھر آئی ہوئی تھی۔وہ عشاء کی نماز کی امامت کیلئے مسجد میں تھے۔اور پیچھے یہ سب ہوا۔''ایک بار پھر شیراز کی آواز گونجی تو نوید نے ضبط سے اپنی گردن دبائی۔اُسکے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔تو شیراز؟ اُسکا کیا؟

''شیراز!''نوید نے ایک مرتبہ پھر اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چلو اٹھو! میرے ساتھ آؤ!''نوید نے کہا تو وہ خاموشی سے کھڑا ہوا جیسے روبوٹ ہو۔

''خواتین عملے سے کہو کہ لاش کو فوراً فرانزک کے لیے لے کر جائیں۔اور تم لوگ اس بے غیرت سمیر کو فوراً گرفتار کرکے لاؤ۔چاہے وہ زمین میں دفن کیوں نہ ہو چکا ہو، وہاں سے بھی نکال کر لاؤ اسے۔''نوید نے حکم دیتے ہوئے کہا تو دونوں اہلکار حکم کی تعمیل میں دوڑے۔

شیراز نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا پر اُسکے قدم لڑکھڑا گئے۔اسے فوراً ایک جانب سے فیصل نے اور دوسری جانب سے نوید نے تھاما تھا، ورنہ وہ گر جاتا۔

''صبر کرو!''فیصل اسے کہہ رہا تھا۔پر نوید نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔۔۔

صبر کرنا آسان نہیں ہوتا!

----------+---------+--------

رات ایک بار پھر بے چینی سے کٹی تھی۔اُن میں سے کوئی بھی نہ سو سکا تھا۔نوید سے دوبارہ انکا سامنا بھی نہ ہوا۔ایسا لگتا تھا جیسے اسکردو میں گزارا گیا وقت، کوئی اچھا خواب تھا۔اور اب وہ حقیقت کی دنیا میں بیدار ہو گئے تھے۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔نوید، شیراز کے ساتھ ایف آئی اے کے لیونگ ایریا میں بیٹھا تھا۔نمرہ کی لاش کا فرانزک ہو چکا تھا،لاش وہاں سے آجاتی تو اسکے بعد شیراز نے تدفین کے لیے جانا تھا۔اُس کا کل اثاثہ فقط اُسکی ماں اور نمرہ تھی۔اور کوئی نہ تھا اُسکا۔جنازے کا انتظام فیصل نے کر دیا تھا۔شیراز اب تک کل والے خون آلود لباس میں ہی تھا۔

بلڈنگ میں کام کرنے والا دیگر عملہ وہاں سے گزرتا تو کچھ دیر رک کر شیراز سے تعزیت کرتا یا تسلی کے چند بول کہہ دیتا۔وہ کچھ نہ کہتا۔بس سر جھکائے بیٹھا رہتا۔اسکی جانب سے نوید ہی سب کو جواب دے رہا تھا۔

رات سمیر کو ایک قوالی نائٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔وہ کل شام سے رات گرفتاری تک وہیں تھا، سی سی ٹی وی فوٹیج میں اور عینی شاہدین کے مطابق بھی وہ وہیں تھا۔فلحال اسے شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا۔اُس نے بھی بڑے پرسکون انداز میں گرفتاری دے دی تھی۔اور اب تفتیشی کمرے میں بڑے مزے سے بیٹھا ہوا تھا۔

پہلے فرح اور اب یہ بدبخت،اُن دونوں مجرمین کے پرسکون انداز پر نوید کا دماغ گھوم رہا تھا۔

''فرّخ صاحب اندر بلا رہے ہیں۔''فیصل نے آکر اطلاع دی تو وہ کھڑا ہوا، پھر ایک نظر شیراز کو دیکھا۔

''چلو ساتھ!''اُس نے ایک بار پھر اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔ تو وہ پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل رات سے اب تک وہ اتنا خاموش تھا جتنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قوّت گویائی سے محروم ہو گیا ہو، نہ چیخا نہ چلایا نہ آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو کا بہایا۔ ایسے جیسے کوئی حس ہی باقی نہ رہی ہو۔ یا یہ طوفان آنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔

وہ دونوں اندر آئے تو فرّخ صاحب ہمیشہ کی طرح اپنی کرسی پر تھے، چہرے پر فکروں کے جال بچھے تھے۔ فیصل بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا جبکہ نوید نے اپنی مخصوص کرسی کھینچی اور اس پر شیراز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود وہ کھڑا رہا۔

''نوید! کیسے ہو تم؟''اس سے پہلے کہ کوئی بھی کچھ کہتا، اُسکے برابر میں آکر کسی نے کہا تو وہ مڑا۔

''ساگر؟''اُسکا ہم منصب، اور ٹریننگ کے دوران اُسکا روم میٹ ایس ایس پی ساگر کمار سامنے تھا۔

''کیسے ہو؟''نوید نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''اُس نے آہستہ سے کہا، اور ایک نظر شیراز کو افسوس سے دیکھا۔

''ایس ایس پی ساگر کمار نے ہی سمیر کا کیس لیا ہے۔ کل رات سے تمام تفتیش اسی نے کی ہے۔ ساگر! ہمیں اپڈیٹ کریں۔''فرّخ صاحب نے کہا تو ساگر سامنے اسکرین کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نوید اب بھی نہ بیٹھا۔

''نمرہ۔۔۔''ساگر نے کہنا شروع کیا پھر رکا۔'' یعنی ڈیتھ باڈی کی ابتدائی فرانزک رپورٹ کے مطابق کہیں بھی سمیر کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔ وہ کل رات قوالی نائٹ میں تھا۔ اور جس وقت حادثہ پیش آیا تب بھی وہ وہیں تھا۔''اُس نے کہا۔

''اسکا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس جرم میں ملوث نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے اُس نے خود کو بچانے کے لیے تمام منصوبے بنا رکھے تھے۔''نوید نے کہا۔

''آف کورس! ایسا ہی ہے۔ وہ چاروں لوگ جو اِس۔۔۔۔''وہ ایک بار پھر رکا اور زبان لبوں پر پھیرتے ہوئے شیراز کو دیکھا۔ جو اب بھی سر جھکائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔''جو اِس گینگ ریپ میں شامل تھے۔''شیراز نے سختی سے آنکھیں میچی، نوید کی رگیں تن کر

ابھری، آنکھ کے برابر موجود زخم کا نشان واضح ہوا۔ ''وہ سب کے سب جائے وقوعہ سے فرار ہوتے وقت، ایک ٹرک کی زد میں آکر جاں بحق ہو گئے۔ ٹرک ڈرائیور مفرور ہے۔ ظاہر ہے، اُنہیں مروا دیا گیا ہے۔ لیکن۔۔۔'' وہ رکا۔

''لیکن؟''، فیصل نے پوچھا۔

''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اُن چاروں کا سمیر سے کسی بھی قسم کا رابطہ ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ نہ سمیر نے پچھلے دنوں اپنے بینک سے کوئی ٹرانزیکشن کی، نہ اُس نے کسی کو کوئی رقم دی۔ ہم مزید ڈیٹا اکھٹا کر رہے ہیں۔ پر فلحال وہ کسی بھی طرح سے مجرم ثابت نہیں ہو رہا ہے۔'' اُس نے بات مکمل کی۔

''تو؟'' نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''تو یہ کہ اگر رات تک آنے والے ڈیٹا میں، ہمیں اُسکے متعلق کچھ نہ ملا تو۔۔۔ تو ہمیں اسے چھوڑنا ہو گا۔'' جواب فرّخ صاحب نے دیا تھا۔ نوید طنزیہ ہنسا۔ جیسے وہ اسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔

''جب وہ آپکے پاس تیزاب گردی کے کیس میں آیا تھا، تب تو وہ مجرم تھا، اُسکے خلاف ثبوت بھی موجود تھے۔ پھر وہ کیوں آزاد گھوم رہا تھا؟'' نوید نے پہلی بار فرّخ صاحب سے سوال کیا تھا۔

''کیونکہ وہ عدالت سے عبوری ضمانت لے چکا تھا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ چاہتے تو یہ نہ ہوتا۔'' نوید نے کہا تو انکے ماتھے پر بل پڑے۔

''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟ میں قانون ہاتھ میں لے لیتا؟ عدالت کے خلاف چلا جاتا؟ اگر وہ مجرم ثابت نہیں ہوا، تو میں اسے حبس بے جا میں نہیں رکھ سکتا ہوں۔ چاہے ہمارے دل کو کتنا ہی پکا یقین کیوں نہ ہو کہ وہ مجرم ہے۔'' وہ کل سے اُسکی بدتمیزی برداشت کر رہے تھے۔ آج انہیں بھی غصّہ آ گیا تھا۔ اُنکے جواب پر پہلی بار شیراز نے چہرہ اٹھا کر اُنہیں دیکھا، اُسکی نظروں میں کچھ تھا۔۔۔ کچھ بہت ہی خوفناک سا۔۔۔ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔ کسی نے اسے روکا نہ اُسکے پیچھے گیا۔ اسے اکیلے ہی رہنا چاہیے تھا۔

''آپ اگلے ہفتے ریٹائر ہو رہے ہیں نا؟''نوید کا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔فرّخ صاحب کی رگیں تنی۔

''آپ یہ کہیں کہ جانے سے پہلے آپ خود کو کسی مسئلے میں پھنسانا نہیں چاہتے، صاف شفاف ریٹائر منٹ چاہتے ہیں تا کہ باقی کی زندگی سکون سے گزار سکیں۔ورنہ نمرہ آپکی بیٹی ہوتی تو۔۔۔''

''ایس ایس پی نوید! اپنی۔۔۔حد میں رہو!''انہوں نے حد درجے سرد لہجے میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا تھا۔نوید مسکرایا، اُسکا انداز باغیانہ تھا۔ایسا تو اُس نے اپنے بچوں کو قتل کرنے والی فرح خالد کو آزاد دیکھ کر بھی نہ کیا تھا۔ساگر اُسکے قریب آیا اور اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

''تم نے کتنی ہی دفعہ قانون ہاتھوں میں لیا ہے، کتنی بار اپنی من مانی کی ہے۔اور میں نے ہر بار تمہیں بچایا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، ملک میرے اشاروں پر چلتا ہے؟''انہوں نے مزید کہا۔

''میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔''نوید نے انکی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔''آپکے عہد میں مجرم آزاد گھومتے رہے ہیں۔ جانے سے پہلے یہ سچ قبول کر کے جایئے گا۔''اُس نے آج کوئی لحاظ نہ رکھا تھا۔ فرّخ صاحب نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر شہادت کی انگلی اٹھا کر دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

''آؤٹ!۔۔۔'' سختی سے کہے گۓ اِس لفظ پر اُس نے ایک مرتبہ پھر افسوس بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور باہر نکل گیا۔فرّخ صاحب نے سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

(راہداری خاموش تھی، آس پاس عملہ موجود نہ تھا۔اس جانب ویسے بھی ہر کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ایسے میں وہ خطرناک تاثرات اور وحشت ناک حد تک خاموشی لیے اُس کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔)

نوید باہر آیا اور بلڈنگ کے احاطے میں بنے باغ میں رکھی لکڑی اور لوہے سے بنی بینچ پر بیٹھ گیا۔سورج سروں پر تھا۔اُسکا دماغ آج واقعی کام کرنے سے انکاری ہو رہا تھا۔ورنہ ہر حالت میں کمپوز رہنے والے نوید نے کبھی اتنی جذباتیات نہ دکھائی تھیں، پر کل سے جو ہو رہا تھا، وہ اُسکے اعصاب پر بھی بھاری پڑ رہا تھا۔کل رات سے وہ بشریٰ سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کر سکا تھا۔صبح اُس کا میسج آیا تو نوید نے بس اپنی خیریت بتا کر موبائل بند کر دیا۔نہ اُس سے اُسکی خیریت دریافت کی نہ اُسکے دن کے بارے میں پوچھا۔وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔البتہ

نمرہ والے واقعی کے بعد اُس نے گھر کے گرد سیکیورٹی سخت کردی تھی۔ اسے فرح پر کوئی بھروسہ نہ تھا، اُسکے آدمی کہیں بھی ہو سکتے تھے۔

گو کہ فرح کی کسی بھی بات پر اسے یقین نہ تھا۔ بلکہ اسکا کامل یقین تھا کہ اُسکے بیٹے مر چکے ہیں۔ وہ عورت فقط انکا وقت ضائع کرنا چاہتی تھی۔ انہیں ان جھوٹی باتوں میں لگا کر وہ یقیناً کسی اور مقصد کے لیے وقت لے رہی تھی۔ اگر اُسکی بات پر یقین کرنے کے بجائے ایف آئی اے اُس سے کڑی تفتیش کرتا، تو وہ اب تک سب اُگل چکی ہوتی۔ پر نویدِ اس معاملے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا، کیوں کہ آخری فیصلہ فرّخ صاحب ہی کرتے تھے۔ جتنا وقت وہ ضائع کرواکے انکا دھیان بھٹکا رہی تھی، اتنے وقت میں وہ یقیناً کوئی بڑا کام کرنے والی تھی۔ وہ بشریٰ، جزا اور امی کے لیے پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

(خاموش راہداری کے اختتام پر اپنے مطلوبہ کمرے کے باہر رک کر اُس نے آس پاس دیکھا، پھر دروازے کے برابر میں رکھا لوہے کا بھاری بھر کم گلدان اٹھالیا، جسکے بارے میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ یہاں کیوں ہے آخر؟)

''اگر آپکی سگی بیٹی ہوتی، تو کیا تب بھی آپ عدالت کے فیصلے کا انتظار کرتے؟'' کمرے کی خاموش فضا میں فیصل کی آہستہ آواز گونجی تو فرّخ صاحب نے چہرہ ہاتھوں سے اٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور اس بار وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

''کیا حیدر نسیم یاد ہے آپکو؟ سائبر کرائمز ڈیپارٹمنٹ کا آفیسر، جس نے ایک دن اپنے ہی آفس میں خودکشی کرلی تھی۔ حالانکہ ہم سب جانتے تھے کہ وہ خودکشی نہیں تھی، پر ہم کچھ نہ کر سکے۔ منہاج لغاری، جس نے ہسپتال میں مریضوں کے اعضاء نکال کر بیچنے والوں کے خلاف پورا کیس اپنے سر لیا تھا۔ اُسکے بھائی کو اُٹھا کر لے گئے تھے وہ لوگ، اور جب چھوڑا تو اُسکا بھائی اپنے دونوں پیروں سے معذور ہو چکا تھا۔ ٹینس کا پلیئر (کھلاڑی) تھا وہ لڑکا۔ اور ایسے بہت سے ہیں سر! بہت سے۔۔۔ جنکے مجرم آزاد ہیں۔ کیونکہ عدالت کچھ ثابت نہ کر سکی۔'' اُس نے کہا۔

''تو تمہارے خیال میں، کیا کروں میں؟'' اب کہ انہوں نے تھک کر پوچھا تھا۔

''آپ اُسے جانے نہ دیں۔ وہ آج چلا گیا تو کل اِس ملک کے کسی بھی کونے میں نہیں مل سکے گا۔ آپ وہ کریں جو آپ اپنی بیٹی کے لیے کرتے۔'' فیصل نے سرخ آنکھوں سے اُنہیں دیکھا۔

''شیراز کی بیوی کل رات بے دردی سے قتل ہوگئی ہے۔''اُنکے کچھ بھی کہنے سے قبل ساگر کمار کی آواز کمرے میں گونجی۔''پر وہ کل سے اب تک کسی مردے کی طرح خاموش ہے۔کیا آپ جانتے ہیں میں اُس میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''اُس نے سنجیدگی سے اُنکی آنکھوں میں دیکھا،''ایک اور حیدر نسیم،ایک اور منہاج لغاری،ایک اور نوید عالم۔۔۔کسی مجرم کو تو روک لیں۔کسی کو تو۔۔''ساگر نے بھی جیسے التجا کی تھی۔فرّخ صاحب بھی اپنی جگہ درست تھے۔وہ کیسے قانون ہاتھ میں لیتے؟پر وہ سب بھی ٹھیک کہہ رہے تھے،اگر اُنکی اپنی بیٹی نمرہ کی جگہ ہوتی تو وہ دنیا الٹ دیتے۔وہ عجیب دوراہے پر آکھڑے ہوئے تھے۔

(اُس نے تفتیشی کمرے کا ہینڈل گھمایا اور اندر آیا۔دروازہ اپنے پیچھے ہی کھلا چھوڑ دیا۔جیسے اُسے اب کسی کے اپنے پیچھے آنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔اُسکا مجرم سامنے تھا،اُسکی ایک آنکھ پتھر کی تھی،ہتھکڑیاں اُسکے ہاتھوں میں تھیں۔شیراز کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خباثت سے مسکرایا۔وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اُسکے قریب آیا،اور اگلے ہی لمحے ہاتھ میں پکڑا لوہے کا گلدان پوری قوت سے سمیر کے سر پر دے مارا۔)

باغ میں بیٹھے نوید نے کھلی راہداری میں عملے کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو ناسمجھی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تیزی سے راہداری میں آیا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے قریب سے گزرتے ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔

(سمیر کرسی سمیت نیچے گرا تھا۔اُسکا سر پھٹ چکا تھا۔خون چاروں جانب پھیل رہا تھا۔اسی لمحے شیراز نے گلدان دوبارہ اٹھایا۔

''شیراز!یہ کیا کر رہے ہو؟''کوئی دوسرا آفیسر پیچھے سے چیخا تھا۔گلدان سمیت شیراز کا بلند ہاتھ ہوا میں ہی رکا۔اُس نے آہستہ سے پلٹ کر آنے والے کو دیکھا۔اُسکی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر آنے والے کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔اُسکے چہرے پر درندوں جیسی وحشت تھی۔

''شی۔۔۔شیراز!''آنے والا اُسکا نام بھی ادا نہ کر سکا۔شیراز واپس پلٹا اور اگلے ہی لمحے گلدان ایک بار پھر،پوری قوت سے نیچے گرے سمیر کے سر پر دے مارا۔ آنے والا آفیسر خوفزدہ انداز میں چلا چلا کر باقی عملے کو پکارنے لگا۔شیراز گہری گہری سانس لیتا اپنے اندر کا لاوا کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔)

''اے ایس پی شیراز۔۔۔''وہ آدمی بوکھلایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا شیراز کو؟''نوید چیخا۔

''اُس نے سمیر کو قتل کر دیا ہے۔''اگلے ہی لمحے نوید دوڑتا ہوا تفتیشی کمرے کی جانب گیا تھا۔

عملہ وہاں جمع ہونے لگا۔ سمیر زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔اُن میں سے کچھ لوگ شیراز کو روکنے آگے بڑھے، پر اسی لمحے اُس نے جیب سے بندوق نکالی اور اُن سب کے پیروں کے سامنے فائر کیا، سب ہڑ بڑا کر پیچھے ہوئے، یہ اُنکے لیے ایک وارننگ تھی۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔اُسکی آنکھوں میں موجود وحشت اُنکا دل ہولا رہی تھی۔اُس نے پلٹ کر نفرت بھری نگاہ نیچے گرے سمیر پر ڈالی، پھر آگے بڑھا اور گلدان دوبارہ ہوا میں بلند کیا۔

''شیراز رک جاؤ!''نوید پیچھے سے چیخا تھا۔پر وہ رکا نہیں،اس نے ایک مرتبہ پھر گلدان اُسکے سر پر دے مارا۔ سمیر ساکت ہو گیا۔

''شیراز۔۔۔''نوید نے لب بھینچے، پھر دوڑ کر سمیر کے پاس آیا۔ جھک کر اسکی نبض چیک کی۔ وہ زندہ تھا۔ حالانکہ نوید کی دلی خواہش تھی کہ وہ جہنم واصل ہو جائے، پر اِس وقت شیراز کی بقا کے لیے اُسکا زندہ رہنا ضروری تھا۔

''اسے فوراً ہسپتال لے جانا ہو گا۔ یہ زندہ ہے۔۔۔ یہ مرنا نہیں چاہیے۔''نوید چلا رہا تھا۔ عملہ تیزی سے حرکت میں آرہا تھا۔ گلدان ہاتھ میں پکڑا شیراز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ خون آلود گلدان اب بھی اُسکے ہاتھوں میں تھا،اُسکی چال،اُسکا چہرہ، وہ کہیں سے بھی نارمل انسان نہیں لگ رہا تھا۔ راہداری میں کھڑے لوگ اپنے آپ پیچھے ہٹنے لگے۔ ساگر، فیصل اور فرّخ صاحب بھی وہاں آچکے تھے۔ آنکھوں میں بے یقینی لیے وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''شیراز۔۔۔''فیصل نے آگے بڑھ کر اُسے روکنا چاہا۔ اور کسی کی تو ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔ وہ بنا رکے آگے بڑھتا رہا۔

''شیراز پلیز! میری بات سنو!''ساگر نے بھی روکنا چاہا پر وہ نہ رکا۔ نوید فوراً باہر آیا،اُسکے پیچھے عملہ سمیر کو اسٹریچر پر لٹا چکا تھا۔

''شیراز۔۔۔''نوید تیزی سے اُسکے پیچھے آیا اور اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ اگلے ہی لمحے جیسے شیراز کو کرنٹ چھو گزرا تھا، یا کوئی طاقت اُسکے اندر آسمائی تھی۔اُس نے پلٹتے ہوئے نوید کا ہاتھ جھٹکا اور

''اکیلا چھوڑ دو مجھے۔۔۔'' وہ اپنی آواز کے آخری نوٹ پر چلایا تھا۔ اتنی بلند، اور فلک شگاف آواز کہ اُسکی شدت سے اُسکے جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہاں کھڑے ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا۔ اُسکی دونوں آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر بہہ نکلے تھے۔ نوید کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ یہ وہ لاوا تھا جو کل رات سے پک رہا تھا، اور اب آتش فشاں بن کر پھٹا تھا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' اُس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی اور تیز تیز چلتا وہاں سے نکل گیا۔ نوید اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا، نہ ہی کوئی اُسکے پیچھے گیا نہ فرّخ صاحب کچھ کہہ سکے۔

اُس نے انصاف کا انتظار نہیں کیا تھا۔

اُس نے عدالت خود ہی لگالی تھی۔

----------+---------+--------

رات اُن سب کو ایف آئی اے نے بلوایا تھا۔ ساتھ انکا سامان بھی گاڑی میں رکھ لیا گیا تھا۔ شاید وہ مشاورت کے بعد سیدھا اپنے اپنے گھر جانے والے تھے۔ ایف آئی اے کی بلڈنگ کے احاطے میں وہ سب اُترے تو نوید کو کھلی راہداری میں کھڑا پایا۔ وہ سیاہ شلوار کرتے میں ملبوس، ستون سے ٹیک لگائے، دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے یک ٹک سامنے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر ہو نہ ہو، پر آنکھیں عجیب اُداس سی تھیں۔ اُس نے انکے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ اُسکا چہرہ اُسکے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا غماز تھا۔

''نوید! تم ٹھیک ہو؟'' اُسکے قریب آتے علی نے رک کر پوچھا، تو اُس نے بنا اسکی طرف دیکھے فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔ علی نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ دور، باغ میں بنی بینچ پر، نیوی بلیو رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس، سر جھکائے بیٹھے شیراز کو دیکھ رہا تھا۔

دوپہر نمرہ کے جنازے کے لیے نوید اُسے اپنے ساتھ ہی لیکر گیا تھا، جنازے پر بہت بڑی عوام آئی تھی۔ جنازے و تدفین سے واپسی پر نوید اُسے پھر یہیں لے آیا۔ اب وہ شام سے اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ نوید بھی اُس پر سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ فرح خالد کو بھی بھول چکا تھا۔

سمیر کے خلاف تمام ثبوت اکھٹے ہو گئے تھے۔اس میں کمال صرف ساگر کمار کا تھا۔ وہ اس معاملے کی تہہ تک چند گھنٹوں میں پہنچا تھا۔سب سے پہلے اُس نے مفرور ٹرک ڈرائیور کو پکڑا، تھوڑی دیر میں ہی اُس نے بتادیا کہ اُسے ایک جابر نامی شخص نے قتل کا حکم دیا تھا۔ڈرائیور کے ذریعے ہی جابر تک پہنچا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ بندہ سمیر سے رابطے میں تھا۔ وہ دونوں فون پر رابطہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اُنھوں نے ایک غیر ملکی عام سی ایپلیکیشن، جسکا اِس ملک میں کسی کو علم بھی نہ تھا،اس مقصد کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ سمیر کا ایک ذاتی کیٹل فارم تھا، وہ کچھ بیوپاریوں کے ذریعے مویشی فروخت کرتا تھا۔کچھ دنوں پہلے اُس نے آٹھ لاکھ نقد رقم کے عوض ایک جانور بیچا تھا۔وہ نقد رقم اُس نے جابر کے حوالے کی اور باقی کا تمام کام اُس نے کر دیا۔اسی لیے اُس رقم کا کوئی ڈیٹا موجود نہ تھا، یہ سب جابر کی زبانی معلوم ہوا۔ سمیر نے جتنی صفائی سے یہ کام کروایا تھا،اُس تک پہنچنا آسان نہیں تھا،اِس میں واقعی ساگر کی ذہانت تھی۔اُس نے تمام ثبوت اکھٹے کر لیے تھے، اب دنیا کی کوئی طاقت سمیر کا جرم چھپا نہ سکتی تھی۔

بلڈنگ کو صبح سے سانپ سونگھا ہوا تھا۔ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی وہاں پر۔ پتہ نہیں شیراز کے بارے میں فرّخ صاحب نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ نوید کو وہ دن یاد آیا جب وہ اسی باغ میں بیٹھ کر گٹار بجاتا گا نا گنگنا رہا تھا۔اچھے دن اتنی جلدی کیوں نکل جاتے تھے؟

”سر! آپ کچھ کھائیں گے؟“ پاس سے گزرتے ملازم نے رک کر پوچھا تو وہ چونکا۔ باقی سب اندر جا چکے تھے۔ ملازم کے ہاتھ میں دو ٹرے تھیں،ایک میں بہت سارے شاورمہ رول پڑے تھے،اور دوسرے میں چائے کی پیالیاں تھیں۔

”ہاں! ایک رول،اور دو کپ چائے دے دو۔“اُس نے کہا تو ملازم نے بینچ پر دونوں ٹرے رکھی،اور اُسکی مطلوبہ پلیٹ بنا کر اسکے حوالے کی۔نوید نے پلیٹ تھامی اور راہداری سے اُتر کر باغ میں آیا پھر شیراز کے قریب آرکا، بینچ کے ہینڈل کو کھولا تو وہ ایک ٹرے کی طرح شیراز کے سامنے آ گیا۔ وہ سیدھا ہوا اور نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔نوید نے چائے اور شاورمہ اُسکے سامنے کھلنے والی ٹرے نما ڈیسک پر رکھا،اور دوسری پیالی اپنے ہاتھ میں لیکر اُسکے برابر بیٹھ گیا۔ شیراز خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

”کھالو! تم کل سے بھوکے پیاسے ہو۔“اُس نے نرمی سے کہا۔ آنکھوں میں پُر شفیق سا تاثر تھا۔ شیراز نے چہرہ واپس موڑ لیا۔ نوید کو اُس سے ہمدردی نہیں تھی، بلکہ اسکا دکھ اپنے دل پر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے اُسکا جونیئر رہا تھا۔ ہر اہم کیس میں اُسکی ٹیم کا حصّہ

ہوتا تھا۔ نوید کی بڑے بھائیوں جتنی عزت کرتا تھا۔ اور وہ اسے چھوٹے بھائی جتنا ہی عزیز تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر نوید نے گہری سانس لی اور تھک کر چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔

''میں نے نمرہ کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔'' خاموش فضا میں شیراز کی آہستہ آواز گونجی تو نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔

''وہ پردہ کرتی تھی، اور میں اُسکے پردے کا احترام۔ ایک دفع میں نے اُسے بچوں کو درس دیتے ہوئے سنا تھا۔'' وہ جیسے یاد کر کے مسکرایا۔ نوید نے اُسے نہیں چھیڑا۔ وہ اُسکی آنکھیں دیکھ رہا تھا، وہ آنکھیں یہاں نہیں تھیں۔ وہ دور کہیں خوبصورت ماضی کو دیکھ رہی تھیں۔

''پھر مجھے معلوم ہوا کہ سمیر نے اُسکے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ وہ ہسپتال میں تھی، تب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ اُسکا آدھے سے زیادہ چہرہ تباہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی شکوے کا اپنی زبان پر نہ لائی، بلکہ صبر کے ساتھ سب برداشت کرتی رہی۔ اُس دن مجھے وہ دنیا کی خوبصورت ترین عورت لگی۔ اور وہ تھی بھی۔۔۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔'' اُس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ نوید نے اُس سے نظریں ہٹائی اور سامنے نظر آتی گھاس پر مرکوز کر دیں۔

''جس عورت کے باطن سے محبت ہو جائے، وہی دنیا کی حسین ترین عورت ہوتی ہے۔ پھر اُس میں کوئی عیب نظر بھی نہیں آتا۔'' نوید نے مسکراتے ہوئے پہلی بار کسی سے دل کی بات کہی تھی۔ بشریٰ بھی تو اپنی تمام تر خراب ذہنی حالت کے باوجود اُسکے لیے خوبصورت ترین اور مکمل عورت تھی۔

''میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔ اب اُس کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ تم اے ایس پی شیراز کی بیوی ہو، اب کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ پر میں اُسکی حفاظت نہ کر سکا۔۔۔ میں اُسے بچا نہ سکا۔'' شیراز کے لہجے میں کچھ ٹوٹا تھا، نوید نے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔

''مجھے معاف کر دو شیراز! اگر کر سکو تو۔۔۔ سارا قصور میرا ہے۔'' نوید نے آہستہ سے کہا پر شیراز کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے بات جاری رکھی۔ ''اُس نے یہ سب ضد میں کیا۔ اگر اُس روز میں اُسے فقط سبق سکھا کر ہی واپس آ جاتا تو بھی کافی تھا اُسکے لیے۔ پر میں شدید غصّے میں تھا، اُس نے میری بہن کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ واقعہ یاد کر کے اُسکی کنپٹی کی رگیں دوبارہ تنی۔ ''اگر میں اُسکی آنکھ نہ ضائع کرتا تو شاید وہ بھی یہ سب نہ کرتا، اُس نے صرف ضد میں ایسا کیا ہے۔'' نوید کے لہجے میں افسوس بول رہا تھا۔

''اگر آپ نہ بھی کرتے، تب بھی یہ ہونا ہی تھا۔ سمیر نے نہیں رکنا تھا۔ وہ تب بھی نہیں رکا تھا، جب اُسکا کیس میں نے فرّخ صاحب کو اور اُنہوں نے آپکو دیا تھا۔ یہ ایسے ہی ہونا تھا۔'' وہ کہتے ہوئے اچانک، ٹرے گھوماتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ایک لقمہ بھی نہ کھایا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' نوید بھی گھبرا کر اٹھا۔ وہ واقعی اُسکے لیے بہت پریشان تھا۔

''گھر جا رہا ہوں، امی کل سے اکیلی ہیں۔ کچھ دیر آرام چاہتا ہوں۔ کل سے ڈیوٹی جوائن کر لوں گا۔''

''کل سے کیوں؟ تم کچھ دن سکون سے آرام کرو۔'' نوید نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''سکون نہیں ہے میری زندگی میں اب، نہ ہی ذہنی آرام۔۔۔ میں صرف جسمانی آرام کی بات کر رہا ہوں۔ کل سے آجاؤں گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ گیا۔ نوید وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ فرّخ صاحب نے اُسکے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا، سمیر کے زندہ بچ جانے کی وجہ سے اُسکی فکر تھوڑی کم ہوئی تھی۔

سمیر مرا نہیں تھا۔ اُسکی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، چہرے کی دیگر ہڈیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ دماغ سے جسم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ فلحال ہوش میں نہیں تھا۔ پر ڈاکٹر کے مطابق وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی تاعمر کے لیے پیرالائزر ہنے والا تھا۔ اُسکو اِس حالت میں بھی اُسکے رب نے زندہ رکھا تھا۔ یہی اُسکی سزا تھی۔

بیشک رب کا انصاف بہترین ہے۔

اب نوید عالم بھی رب کی طرف سے، اپنے لیے انصاف کا منتظر تھا۔

--------+---------+----------

مشاورتی کمرے میں عجیب سی خاموشی تھی۔ جو شیراز کے ساتھ ہوا وہ اُنہیں بھی معلوم ہو چکا تھا۔ گو کہ اُس سے اُنکی کوئی دلی وابستگی نہ تھی، لیکن وہ اسے جتنا جانتے تھے، اُسکے بعد دل اُسکے لیے بہت افسردہ تھا۔

''وہ تمام لوگ جو فرح سے رابطہ میں تھے، سب کے سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم اُن سے تفتیش کر رہے ہیں۔ جلد ہی یہ معاملہ بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ تم سب آج رات گھر جا سکتے ہو۔ اپنے اپنے کام شروع کر سکتے ہو، جیسے پہلے کر رہے تھے۔ لیکن۔۔۔'' وہ رکے اور

ایک نظر دروازے سے داخل ہوتے نوید کو دیکھا۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ اندر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ فرّخ صاحب نے اُسکی طرف سے نظریں پھیریں اور گفتگو جاری رکھی۔

''لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے، لہٰذا نہ صرف تم سب کی کڑی نگرانی کی جائے گی، بلکہ تم سب نے خود بھی احتیاط کرنی ہے۔ غیر ضروری کاموں اور گھومنے پھرنے سے پرہیز کرو، جب تک یہ معاملہ مکمل کسی ایک کروٹ نہیں بیٹھ جاتا۔'' انہوں نے بات مکمل کی۔ نوید کا چہرہ سخت سا تھا۔

''اور وہ عورت؟'' عمر نے جھجھکتے ہوئے فرح کے بارے میں پوچھا۔ نوید کے سامنے وہ کہہ نہ سکا، کہ اسکے بیٹے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا یا نہیں؟

''وہ عورت کچھ بھی بتانے پر تیار نہیں ہے۔'' اُنکے پیچھے اسکرین پر فرح خالد کی تصویر ابھری، سب کی نظریں ایک ساتھ اس پر گئیں۔

''پر ہم اُس سے جلد سب کچھ اُگلوا۔۔۔''

''فریحہ؟'' اسی لمحے رضا الٰہی کی شدید شاک میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

''کچھ کہا تم نے؟'' فرّخ صاحب نے رک کر اسے دیکھا۔

''یہ تو۔۔۔ یہ تو فریحہ ہے۔'' اُسکے حیرت میں ڈوبے لہجے پر اب کہ نوید نے بھی بھنویں سکیڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''فریحہ کون؟ یہ فرح ہے، فرح خالد۔۔۔ تم اسے جانتے ہو؟'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''یہ فریحہ ہے، میں اسے پچھلے تین سالوں سے جانتا ہوں۔ اسکا بیٹا ولید میرے پاس ہوتا ہے۔'' اگلے ہی لمحے نوید اور فرّخ صاحب دونوں ہی بے ساختہ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا کہا تم نے؟'' نوید نے بے یقین نظروں سے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''رضا مجھے شروع سے بتاؤ!'' فرّخ صاحب نے پوچھا۔ رضا کو شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

''یہ میرے پاس تین سال قبل آئی تھی،اسکا شوہر مر چکا تھا،اور گھر والے دوسری شادی کردینا چاہتے تھے۔اسکا چار ماہ کا بیٹا ولید تھا، جسے نہ تو اُسکا دوسرا شوہر رکھنے کو تیار تھا اور نہ ہی اسکے گھر والے، تو وہ اسے میرے حوالے کر کے چلی گئی۔ ہر دو سے تین ماہ بعد جب اُسکا شوہر ملک سے باہر جاتا ہے، تو وہ ولید کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔'' رضا نے کچھ پریشان لہجے میں کہا۔

''وہ کس تاریخ کو تمہارے پاس ولید کو لائی تھی؟''فرّخ صاحب نے پوچھا۔ باقی سب کو کچھ کچھ سمجھ آرہا تھا۔

''تین سال پہلے، مئی کی چار تاریخ کو۔''نوید کو لگا کہ چھت اُسکے سر پر آگری ہو۔اس نے فوراً سے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ ورنہ شاید وہ گر جاتا۔ کل سے اب تک ہونے والے تمام واقعات اُسکے اعصاب پر بری طرح توڑ رہے تھے۔ اگر وہ کسی وقت گر پڑتا تو حیرت کی بات نہ تھی۔

''رضا۔۔۔''فرّخ صاحب نے بے بسی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔''وہ اس عورت کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ نوید کا بیٹا ہے۔''فرّخ صاحب نے وہی کہا جسکی اب کو توقع تھی۔ لیکن پھر بھی اس ایک جملے پر سب نے ایک ساتھ نوید کو دیکھا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رضا کو دیکھ رہا تھا۔

ولید عالم۔۔۔

اسکا چار ماہ کا بیٹا۔۔۔

جو تین سال قبل، چار مئی کو جلا تھا۔۔۔

یا شاید۔۔۔

اغوا ہوا تھا۔۔۔

اگلے ہی لمحے نوید تیزی سے رضا کے پاس آیا، اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

''وہ۔۔۔وہ تمہارے پاس ہے ابھی؟''اُس نے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے پوچھا تھا۔اُسکی حالت عجیب سی ہو رہی تھی، تنفس تیز تھا۔

''ہاں! وہ یقیناً پناہ گاہ میں ہی ہے۔'' رضا نے اسے دیکھتے تسلی دی تھی۔ نوید نے پلٹ کر فرّخ صاحب کی طرف دیکھا۔

''جاؤ۔۔جاؤاور اُسے فوراًیہاں لے کر آؤ۔''فرّخ صاحب نے کہاتو وہ رضا کا بازو چھوڑتے تیزی سے باہر نکلا۔

''میں بھی آرہاہوں۔'' رضا پیچھے گیا۔

''ہم جاسکتے ہیں؟'' علی نے بے قراری سے سب کی جانب سے پوچھا۔

''ہاں! جاؤ۔۔۔'' انہوں نے کہاتو وہ بھی باہر کی جانب بھاگے تھے۔ رضا فوراًعائشہ جی کو فون کرنے لگا، پر وہ فون نہیں اٹھارہی تھیں۔

نوید کا تنفس تیز ہوتا جارہا تھا، دل کی دھڑکن کی رفتار بھی پہلے سے کہیں آہستہ ہورہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہورہے تھے، اور دل کے مقام پر درد اٹھ رہا تھا۔ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پارہا تھا۔

----------+---------+--------

پناہ گاہ کے احاطے میں وہ سب باری باری داخل ہوئے تھے۔ آنے والوں میں سب سے پہلے رضا اور نوید ہی داخل ہوئے تھے۔ لان میں بیٹھی عائشہ جی، جزا کے ساتھ کھڑی تھیں، جس کے کندھوں پر پرس اور سر پر موجود چادر دیکھ کر پتہ چل رہا تھا کہ وہ واپس جارہی تھی، اور عائشہ جی اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔

''عائشہ جی!۔۔۔عائشہ جی!'' رضا اُنہیں پکارتا تیزی سے وہاں آیا، جبکہ لان کے ٹریک پر ہی نوید نے اپنے قدم روک لیے۔ وہ آگے بڑھ کر اُن تک نہیں آیا۔ جیسے وہ آگے آکر مزید کچھ بھی سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ جزا نے کچھ حیرت سے اپنے بھائی کو دیکھا، جسکا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہورہا تھا۔

''رضا! تم کب آئے؟'' عائشہ جی اُسے سامنے دیکھ کر خوش ہوئیں، اس لیے اُسکا پریشان حال انداز دیکھ نہ سکیں۔ پیچھے باقی چاروں بھی اندر آئے تھے۔ وہ بھی رضا کے قریب ہی رکے تھے، جبکہ نوید پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔

''ولید کہاں ہے؟'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

''کیا ہوا؟ اتنا پریشان کیوں ہورہے ہو؟ سب۔۔۔''

''عائشہ جی ولید کہاں ہے؟'' وہ اُنکی بات کاٹتے، تیز آواز میں بولا تھا۔

''آرام سے۔۔'' عمر نے بے ساختہ اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے، اُسے پر سکون رہنے کا کہا۔

''ولید ٹھیک ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟'' عائشہ جی نے کہا۔

''اُسے لیکر آئیں جلدی!'' وہ بے قراری سے بول رہا تھا۔ جب کے ان سب باتوں کی پرواہ کیے بنا جزا سامنے کھڑے اپنے بھائی کو ساکت نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنا بایاں بازو سہلا رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر خوف تھا، وہی خوف جو بچپن میں کوئی غلطی کر دینے کے بعد اُسکے چہرے پر ہوا کرتا تھا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''تو کہاں ہے؟'' وہ چیخ اٹھا۔

''اپنی ماں کے ساتھ ہے وہ رضا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ فریحہ لے گئی ہے اُسے۔'' وہ تو پریشان ہی ہو گئیں۔ جبکہ انکے الفاظ پر جو جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

''کیا مطلب کہ لے گئی؟ کب لے گئی؟'' اُس نے اپنا سر تھامتے پوچھا تھا۔ جزا بیساختہ نوید کے پاس آئی، جو اپنا بایاں بازو تھامے پتھرائی نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ جزا کے علاوہ کسی کا دھیان اُس پر نہ تھا۔

''بھائی! کیا ہو رہا ہے آپکو؟'' جزا نے اُسکے بازو پر ہاتھ رکھتے آہستہ مگر خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو تین روز پہلے اُسے لے گئی تھی۔ '' دوسری طرف عائشہ جی نے جواب دیا۔

''کیسے؟ کیسے جانے دیا آپ نے اسے؟'' وہ تڑپ اٹھا تھا۔

''رضا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' عائشہ جی بھی چلا اٹھیں۔ ''تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ فریحہ جب بھی آئے، چاہے تم یہاں ہو یا نہ ہو، میں فوراً ولید کو اُس کے حوالے کر دوں۔ تم سے اجازت بھی نہ لوں، بس اطلاع دے دوں، اور میں نے تمہیں پرسوں میسیج بھی کیا تھا۔'' رضا دو قدم پیچھے ہٹا۔ یہ اُس نے کیا کر دیا؟ اتنی بڑی غلطی؟

''پر ہوا کیا ہے رضا؟'' وہ تھک کر بولیں۔

''بھائی! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟'' دوسری طرف جزا اُس سے پوچھ رہی تھی۔ جسکا ہاتھ اب اپنے سینے کی طرف، دل کے مقام پر بڑھ رہا تھا۔

''وہ اُسکی ماں نہیں تھی، ولید اُسکا بیٹا نہیں تھا۔ جھوٹ بولا اس عورت نے ہم سے، بیوقوف بنایا اتنے سال۔'' اُسکا بس نہیں چل رہا تھا اپنے بال نوچ ڈالے۔ اس عورت نے کتنی آسانی سے اسکو بیوقوف بنایا تھا۔ مقدّم نے آگے بڑھ کر اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس بات پر جزا نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟ پھر کس کا بیٹا تھا وہ؟'' عائشہ جی نے پوچھا۔

''وہ نوید کا بیٹا تھا، اُس عورت نے اغوا کیا تھا اسے۔۔۔'' عائشہ جی نے منہ ہاتھ رکھ لیا۔ جزا نے پلٹ کر پتھرائی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

''اُس نے ایک اغوا کیے ہوئے بچے کو ہمارے گھر چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ اور اب جب ہمیں پتہ چلا، وہ اُس سے پہلے ہی اسے یہاں سے لے گئی۔'' رضا نے بے بسی سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

نوید عالم۔۔۔

اپنے بیٹے کو ایک بار پھر نہیں بچا سکا۔۔۔

صحیح کہتا تھا اُسکا باپ۔۔۔ وہ بیکار تھا، کسی کام کا نہیں تھا وہ۔۔۔

اسکے دل میں درد کی شدید ٹیس اٹھی، تو اُس نے بیساختہ اپنے برابر کھڑی جزا کا ہاتھ تھاما تھا۔

''بھائی۔۔۔ بھائی! کیا ہو رہا ہے آپکو؟ بھائی!'' جزا یکدم ہی چیخی تو سب نے پلٹ کر نوید کو دیکھا، اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ بھی سمجھتا، نوید کے چہرے پر کرب آمیز تاثرات نمودار ہوئے، اور وہ نیچے جھکا۔۔۔ جیسے گرنے والا ہو۔

''نوید!'' اگلے ہی لمحے سب کو جیسے ہوش آیا تھا، علی، مقدّم اور عمر چیختے ہوئے آگے بڑھے تھے، حسین قریب تھا تو اُس نے فوراً اُسے تھامنے کی کوشش کی پر۔۔۔ اُس سے پہلے ہی وہ اپنے پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔

''بھائی۔۔۔'' جزا حلق کے بل چیختی، اُسکے ساتھ ہی نیچے بیٹھی تھی۔

''نوید!'' باقی سب کے ساتھ رضا کو بھی جیسے اب ہوش آیا تھا۔

''بھائی۔۔۔ بھائی اٹھیں۔۔۔ بھائی۔۔۔'' جزا اُسکا سر گود میں رکھے، اُسکا چہرہ تھپتھپاتے پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

''نوید!۔۔۔ اٹھو نوید۔۔۔'' علی نے اسکو جھنجھوڑا تھا۔ اُسکی آنکھیں مکمل بند ہو چکی تھیں۔

''بھ۔۔۔ بھائی!۔۔۔ میرا بھائی۔۔۔''

----------+---------+--------

(جاری ہے)

میرے پہلے طویل اور بے حد پسند کیے جانے والے ناول کی آخری قسط، ان شاءاللہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کی میری پیج اور ویبسائٹ پر شائع ہو گی۔

آخری قسط سے قبل آپ لوگوں کے جتنے بھی سوالات ہیں، وہ اس پوسٹ کے کمنٹ میں کر سکتے ہیں تاکہ آخری قسط میں اُن سوالات کو شامل کیا جا سکے۔